
کھلے دریچے بند ہوا
مظفر وارثی

ڈوب کر دیکھ سمندر ہوں میں آوازوں کا
طالبِ حُسنِ سماعت میرا سناٹا ہے

مظفؔر وارثی



Pdf, By Misken Mazhar Ali Khan

Cel No, 00966590510687

گروپ، خاکہ، حلم

مظفر وارثی دُنیائے سُخن کا ایک مُعتبر نام ہے۔ حمد ہو یا نعت، غزل ہو یا نظم، گیت ہو یا قطعات، ہر صنفِ سُخن میں اُنھوں نے اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔ وُہ بلا شُبہ عہدِ جدید کے ان چند شاعروں میں سے ہیں۔ جنھیں غیر ممالک میں بھی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے ان کی شاعری میں فکر اور سوچ اپنے تمام تر رنگوں میں عیاں ہیں۔ ان کا ہر مجموعہ دُوسرے سے بڑھ کر خُوبصُورت اور دِلکش ہے ہم اپنے قارئین کے لئے ان کی شاعری کے مُختلف رنگ حسین انداز میں پیش کر رہے ہیں۔

مُحمد سعید اللہ صدّیق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کھلے دریچے بند ہوا

کُھلے دریچے بند ہوا

مظفر وارثی

القمر انٹرپرائزز
رحمان مارکیٹ
اُردو بازار
لاہور

اہتمام : محمد سعید اللہ صدیق



طبع اوّل : جنوری 1993ء
سرِ ورق : ایس ایم فاروق
مطبع : زاہد بشیر پرنٹرز○ لاہور
قیمت : 120 روپے

پُل صراطوں سے گزرنے والے انسانوں کے نام

تبسموں کا تو عاشق ہوں تمکنت کا نہیں
کلی سے ڈرتا ہوں تلوار سے نہیں ڈرتا

ترتیب

پیشِ سخن

انسانیت ، دہشت گرد
شرافت ، ڈاکو
تخت ، جاگیر
دولت ، ورثہ
عدالت ، مقتل
قانون ، ہٹ دھرمی
سچائی ، جرم
فیصلہ ، بے یقینی
سماعتوں پر چیخوں کے غلاف
آنکھوں میں خراشوں کی دھنک
زبان پر زخموں کی چاشنی
ہاتھوں میں جلتے ہوئے گلاب
تیرگی ہی تیرگی — دھواں ہی دھواں
سانسیں کومل ، فضائیں بوجھل
آوارہ سوچ — قیدی ، صدا
کھلے دریچے — بند ہوا



○

ہاتھ آنکھوں پہ رکھ لینے سے خطرہ نہیں جاتا
دیوار سے بھونچال کو روکا نہیں جاتا

واپس نہیں ہونا ہے تو پھر پاؤں کٹا لو
اِس موڑ سے آگے کوئی رستہ نہیں جاتا

دعووں کی ترازو میں تو عظمت نہیں تُلتی
فیتے سے تو کردار کو ناپا نہیں جاتا

فرمان سے پیڑوں پہ کبھی پھل نہیں لگتے
تلوار سے موسم کوئی بدلا نہیں جاتا

ظلمت کو گھٹا کہنے سے ٹھنڈک نہیں ملتی
شعلوں کو ہواؤں سے تو ڈھانپا نہیں جاتا

چور اپنے گھروں میں تو نہیں نقب لگاتے
اپنی ہی کمائی کو تو لوٹا نہیں جاتا

اوروں کے خیالات کی لیتے ہیں تلاشی
اور اپنے گریبان میں جھانکا نہیں جاتا

طوفان میں ہو ناؤ تو کچھ صبر بھی آ جائے
ساحل پہ کھڑے ہو کے تو ڈوبا نہیں جاتا

دریا کے کنارے تو پہنچ جاتے ہیں پیاسے
پیاسوں کے گھروں تک کوئی دریا نہیں جاتا

جو جان سے جائے اُسے قاتل نہیں کہتے
پگڑی کی طرح خون اچھالا نہیں جاتا

اللہ جسے چاہے اُسے ملتی ہے مظفرؔ
عزت کو دکانوں سے خریدا نہیں جاتا



خود سے چراغِ دل نہ بجھا، اور دیکھ لے
کرتی ہے کیا سلوک ہوا، اور دیکھ لے

زخموں سے چور، حُسنِ سماعت سہی، مگر
آتے ہیں کتنے سنگِ صدا، اور دیکھ لے

جذبات کی برستی گھٹائیں تو دیکھ لیں
پانی گھروں میں آتا ہوا، اور دیکھ لے

تو خود ہی اپنے آپ پہ پتھر اٹھائے گا
کچھ دیر آئنے میں ذرا اور دیکھ لے

گلپوش جسم دیکھ کے، رائے زنی نہ کر
اِن بستیوں کے آبلہ پا، اور دیکھ لے

مانگی ہوئی دعاؤں کا کچھ انتظار کر
شکوہ ابھی زباں پہ نہ لا، اور دیکھ لے

بد دل نہ ہو، یہ چاہنے والوں کا شہر ہے
مر تو نہیں گئی ہے وفا، اور دیکھ لے

آنکھیں تجھے ملی ہیں مظفرؔ اسی لیے
منظر بہت سے دیکھ چکا، اور دیکھ لے



زندگی کا زخم گہرا تھا مگر اِتنا نہ تھا
تم سے پہلے بھی میں تنہا تھا مگر اِتنا نہ تھا

آنکھ کیا بھیگی کہ شریانوں میں خاک اُڑنے لگی
بارشوں میں بھی، میں پیاسا تھا مگر اتنا نہ تھا

اپنے اپنے داغ، سب مجھ پر لگانے آ گئے
میرا دامن میلا میلا تھا مگر اِتنا نہ تھا

میری خوشبو کو نہ راس آتی ہوا کی دوستی
یوں گلی کوچوں میں رُسوا تھا مگر اتنا نہ تھا

کیا خبر تھی چھین لی جائیں گی آنکھیں بھی مری
ہاں مجھے شوقِ تماشا تھا مگر اِتنا نہ تھا

رنگ بھی پہنائے اور رکھا بھی مجھ کو دُھوپ میں
وقت کا برتاؤ اچھا تھا مگر اِتنا نہ تھا

کیا بلا شہدِ محبت، چاٹ کر اے زندگی
ذائقہ پہلے بھی کڑوا تھا مگر اِتنا نہ تھا

ہجر میں رونا عبادت ہے مظفرؔ کم نہیں
تجربہ تو آنسوؤں کا تھا مگر اِتنا نہ تھا



صرف احساس کی آنکھوں سے نظر آؤں گا
کسی جھونکے کی طرح اب ترے گھر آؤں گا

تو محبت کی زمیں سے مجھے آواز تو دے
آسماں پر بھی ہوا میں تو اتر آؤں گا

میرے جذبات کی تو نے بھی اگر قدر نہ کی
دیدہ و دل تری دہلیز پہ دھر آؤں گا

میرا دشمن ہے اگر تو، تو مجھے زخم نہ دے
زخم لگنے سے تو میں اور نکھر آؤں گا

نہ دیا تو نے اگر میری دہائی کا جواب
ساری چیخیں ترے ماحول میں بھر آؤں گا

اب نہ آؤں گا شبِ غم کی شکایت لے کر
اب جب آؤں گا باندازِ سحر آؤں گا

دیکھ کر میری طرف، ہاتھ نہ رکھ آنکھوں پر
بند آنکھوں سے بھی میں تجھ کو نظر آؤں گا

تیرے موسم کے سوا اور کوئی رُت نہ ملے
اسی اک شرط پہ آؤں گا، اگر آؤں گا

چاہے مقتل سے سلامت نہ مظفرؔ لوٹوں
ظلم کے سامنے حق بات تو کر آؤں گا



کچھ جنازے کی کچھ برات کی ہے
بس یہی ملکیت حیات کی ہے

نہیں لگتا کہیں سراغ اپنا
اس قدر بھیڑ حادثات کی ہے

ذات میں ڈوب کر بھی دیکھ لیا
یہ بھی تصویر کائنات کی ہے

کہہ رہا ہے دھواں چراغوں کا
روشنی صرف ایک رات کی ہے

ذہن تقسیم ہو گئے، ورنہ
موج راوی میں بھی فرات کی ہے

وحشتِ دل بھی کیوں ذہین نہ ہو
طالبِ علم نفسیات کی ہے

اپنے ہونٹوں پہ زندگی کی دعا
زندگی منتظر وفات کی ہے

جس پہ چلتے ہوئے قدم کانپیں
بس وہی رہگزر نجات کی ہے

وہ مظفرؔ نہیں ہے اور ہے بھی
نفی روح و رواں ثبات کی ہے



خون ہاتھوں پر جلا کر برف پر چلنا پڑا
اتنا آساں تو نہ تھا چلنا مگر چلنا پڑا

آبرو کے ساتھ مقتل سے گزرنے کے لیے
چُور تھا زخموں سے لیکن جھوم کر چلنا پڑا

پاؤں اپنے کاٹ ڈالوں گا خود اپنے ہاتھ سے
مجھ کو دنیا کے اشاروں پر اگر چلنا پڑا

بیٹھے بیٹھے ٹھوکریں سی ذہن میں لگنے لگیں
بن گئیں جب اپنی چیخیں ہی گجر چلنا پڑا

اپنے سینے اپنی آنکھوں پر قدم پڑتے رہے
بے ارادہ بے جہت بے رہگزر چلنا پڑا

میرا موضوعِ سیاحت تھے مخالف راستے
جس طرف سے بھی ہوا آئی اُدھر چلنا پڑا

زندگی میں حشر کے دن کی سزا بھی مل گئی
پلصراطوں پر مظفرؔ عمر بھر چلنا پڑا



خوشبو سے ہوا، سائے سے دیوار نہ بچھڑے
دل چاہے بچھڑ جائے مگر یار نہ بچھڑے

اُٹھتی ہوئی لہروں سے مرے سانس بندھے ہیں
اے کاش مری ناؤ سے منجدھار نہ بچھڑے

رستے سے بچھڑتے ہیں مسافر تو بچھڑ جائیں
منزل سے کوئی قافلہ سالار نہ بچھڑے

نقاد بھی اک ہوتا ہے ہر شخص کے اندر
اُس سے کوئی چہرہ کوئی کردار نہ بچھڑے

ہنستی ہوئی آنکھیں نہ ہوں ویران کسی کی
دو چاہنے والوں کا کبھی پیار نہ بچھڑے

جاتے ہی مرے بند نہ ہو جائیں دکانیں
بازار میں ہی رونقِ بازار نہ بچھڑے

کریں ہم اگر واقعی چلنے کا ارادہ
رستوں سے قدم قدموں سے رفتار نہ بچھڑے

محروم نہ ہو حرفِ صداقت سے زمانہ
منصورِ زمانہ سے اگر دار نہ بچھڑے

دنیا بھی تو اک لفظ کا صدقہ ہے مظفرؔ
لفظوں سے کبھی اپنے قلمکار نہ بچھڑے

○

دیدنی ہیں اُس ستمگر کے گلاب
کانچ کے گلدان پتھر کے گلاب

مسکراہٹ میرے ہونٹوں کی چبھن
اور آنسو دیدۂ تر کے گلاب

دل کی بے چینی محبت کا سہاگ
سلوٹیں بستر کی بستر کے گلاب

آسماں پر چاند تاروں کی طرح
کھل رہے ہیں میرے اندر کے گلاب

لے رہے ہیں جانے کیسا انتقام
خوشبوؤں میں مبتلا کر کے گلاب

ہیں خراشیں ہی خراشیں جسم پر
چُن رہا ہوں زندگی بھر کے گلاب

میرے سینے میری آنکھوں میں کھلیں
میرے بچے ہیں مرے گھر کے گلاب

آبیاری کر رہی ہے تشنگی
کتنے تازہ ہیں مظفرؔ کے گلاب

○

میری جدائیوں سے وہ مل کر نہیں گیا
اس کے بغیر میں بھی کوئی مر نہیں گیا

دنیا میں گھوم پھر کے بھی ایسے لگا مجھے
جیسے میں اپنی ذات سے باہر نہیں گیا

کیا خوب ہیں ہماری ترقی پسندیاں
زینے بنا لیے کوئی اوپر نہیں گیا

جغرافیے نے کاٹ دیئے راستے مرے
تاریخ کو گلہ ہے کہ میں گھر نہیں گیا

ایسی کوئی عجیب عمارت تھی زندگی
باہر سے جھانکتا رہا اندر نہیں گیا

ڈالا نہ دوستوں کو کبھی امتحان میں
صحرا میں میرے ساتھ سمندر نہیں گیا

اُس وقت تک سلگتی رہی اُس کی آرزو
جب تک دھوئیں سے سارا بدن بھر نہیں گیا

ذلت کے بھاؤ بک گئیں عزت مآبیاں
دستار اُس کی جاتی رہی سر نہیں گیا

خواہش ہوس کے روپ میں اچھی نہیں لگی
دنیا کو فتح کر کے سکندر نہیں گیا

کاندھوں پہ اپنے لوگ اُسے لے گئے کہاں
پیروں سے اپنے چل کے مظفرؔ نہیں گیا



تارہ بن جائے بینائی شام کے بعد
ڈھونڈھے اسے میری تنہائی شام کے بعد

دل سورج کے ساتھ ہی ڈوبنے لگتا ہے
زخموں کو چھیڑے گہرائی شام کے بعد

جسم سے اوجھل ہو جاتا ہے سایا بھی
بڑھ جاتا ہے دردِ جدائی شام کے بعد

دیکھ کے اپنا خون شفق کے ہاتھوں پر
اکثر میری آنکھ بھر آئی شام کے بعد

اُس کی میری خوشبو لے کر چلے ہوا
سج بن کر نکلے رسوائی شام کے بعد

توڑ دیا کرتا ہوں ضبط کی زنجیریں
مل جاتی ہے مجھے رہائی شام کے بعد

روز مظفرؔ پھول چڑھاؤں خوابوں پر
گونجے روز کوئی شہنائی شام کے بعد



ظالم سے وفا کرنا دشمن سے مدد لینا
ایسا ہی تو ہے جیسے گھر دے کے لحد لینا

جب پاؤں سلامت ہیں بیساکھیاں پھر کیسی
بالشتوں بونوں سے کیا قامت و قد لینا

تاکید ہمیں کر کے بھیجا ہے محبت نے
وحشت کی دکانوں سے سودائے خرد لینا

جب جنگ کے میداں میں لڑنے کے لئے جاؤ
دشمن کے ٹھکانوں سے سامانِ رسد لینا

ہر ایک سے آخر کیوں میں دادِ ہنر چاہوں
لازم تو نہیں مجھ پر جاہل سے سند لینا

دامانِ مظفرؔ میں کچھ ہے تو محبت ہے
جلتے ہو تو شعلوں سے انعامِ حسد لینا

○

سلامتی کے سفر میں بھی پارہ پارہ ہوں
کس آسمان کا ٹوٹا ہوا ستارہ ہوں

وہ میرے آنسوؤں کے پار ہی تو رہتا ہے
ادھر کی ناؤ ہوں اُس سمت کا کنارہ ہوں

مجھے بجھاتے بجھاتے وہ خود نہ جل جائے
ہوا جسے لیے پھرتی ہے وہ شرارہ ہوں

حقیقتوں کی خراشیں ہیں میرے چہرے پر
مجھے پڑھو میں زمانے کا گوشوارہ ہوں

ہمیشہ میری ضرورت پڑے گی دنیا کو
کہ میں شکستِ محبت کا استعارہ ہوں

جو میرا پیار بھی اپنی ترازوؤں میں رکھیں
میں ایسے آڑھیوں کے لیے خسارہ ہوں

گئے دنوں کا بھی کچھ حق ہے میرے فردا پر
قدیم آرزوؤں کا نیا شمارہ ہوں

یہ رنگ مجھ میں مظفرؔ طلوعِ صبح کے ہیں
کہ ڈوبتے ہوئے خورشید کا نظارہ ہوں

○

بیڑیوں تک پاؤں، سر تلوار تک لایا گیا
کتنی عزت سے مجھے دربار تک لایا گیا

شہر، روشن، میرے اندر کے اُجالوں سے ہوئے
مجھ کو سائے کی طرح دیوار تک لایا گیا

پہلے میری زندگی رکھی گئی تنہائی میں
پھر مری تنہائی کو بازار تک لایا گیا

قتل کرنے کے لیے میری حفاظت کی گئی
تختۂ گل پر بٹھا کر دار تک لایا گیا

دار پر پہلے لیا مجھ سے بیان خودکشی
لاش کو پھر سرخیِ اخبار تک لایا گیا

بادباں کھولے تو اُن میں سینکڑوں سوراخ تھے
خود نہیں آیا، مجھے منجدھار تک لایا گیا

دی گئی پہلے سزا مجھ کو مرے معیار کی
پھر زمانے کو اُسی معیار تک لایا گیا

موت کے ہاتھوں مظفرؔ زندگی مجھ کو ملی
آخری خواہش پہ کوئے یار تک لایا گیا



پھر کیا کرے گا ہمت اگر ٹوٹ جائے گی
تلوار روک لی تو سپر ٹوٹ جائے گی

سر بھی مرے وجود پہ گٹھڑی سے کم نہیں
اِس بوجھ سے تو میری کمر ٹوٹ جائے گی

برداشت کی حدوں سے اگر بڑھ گیا جمال
زنجیرِ احتیاطِ نظر ٹوٹ جائے گی

اے ٹوٹتے ستارو، مرا دل نہ توڑنا
ٹوٹا جو دل، اُمیدِ سحر ٹوٹ جائے گی

رکھا اگر نہ اُس کے تصور سے واسطہ
تو کہکشانِ دیدۂ تر ٹوٹ جائے گی

اتنی محبتیں بھی مظفرؔ کیا نہ کر
بارِ ثمر سے شاخِ ثمر ٹوٹ جائے گی



آنسو جلے بنا دل روشن نہیں ہوتا
ہجر کی آگ سے اچھا ایندھن نہیں ہوتا

اس دنیا کو کچھ دینا بھی پڑتا ہے
سانسیں لیتے رہنا جیون نہیں ہوتا

اپنے خون میں لوگ نہائے پھرتے ہیں
کیا ان آبادیوں میں ساون نہیں ہوتا

دل ٹوٹے تو ذہن بھٹک ہی جاتا ہے
اس کا مطلب دیوانہ پن نہیں ہوتا

ظالم کو ظالم، حالات بناتے ہیں
کوئی تشدّد پسند طبعاً نہیں ہوتا

دوست کا دوست تو ہو سکتا ہے دوست مگر
دشمن کا دشمن بھی دشمن نہیں ہوتا

مقتل کی دیواریں چمک نہیں اٹھتیں
لہو لہو ہوتا ہے، روغن نہیں ہوتا

بہت کشادہ دل ہوتے ہیں اسی لیے
چھوٹے گھر والوں کا آنگن نہیں ہوتا

جن کے ہاتھ مظفرؔ لمبے ہوتے ہیں
کسی کے ہاتھ میں اُن کا دامن نہیں ہوتا



خیر کی کمائی بھی اہلِ شر میں بٹ گئی
جھوٹ کے ہجوم میں سچ کی جیب کٹ گئی

کس قدر سکون سے کھیلتے ہیں خون سے
ظالموں کی زندگی میتوں سے پٹ گئی

خوشبوئیں لیے ہوئے آئی تھی ہوا مگر
جلتا دیکھ کر مجھے دور سے پلٹ گئی

ہم نے جب سفر کیا کچھ نہ سوچ کر کیا
راستے سے گرد اُڑی ذہن سے لپٹ گئی

اپنے ہی وجود سے ہم نہ متفق ہوئے
بد نصیب روشنی پھیل کر سمٹ گئی

رات کی طرح ہمیں دن بھی کاٹنے پڑے
تیرگی کے شور سے نیند ہی اُچٹ گئی

دار تک تو لے گیا میرا سر مجھے مگر
جتنا حوصلہ بڑھا اُتنی عمر گھٹ گئی



کہیں وہ علم تو کالے نہیں پڑھا کرتا
جو صبح صبح اجالے نہیں پڑھا کرتا

زمانہ اصلیتِ آدمی کا قاری ہے
مبصروں کے حوالے نہیں پڑھا کرتا

لکھوں لہو سے سفرنامۂ محبت بھی
میں صرف پاؤں کے چھالے نہیں پڑھا کرتا

وفا، رقیب کی باتیں نہیں سنا کرتی
جنوں، خرد کے مقالے نہیں پڑھا کرتا

شکست و ریخت سے نفرت ہے اس قدر مجھ کو
کہ لفظ ٹوٹنے والے نہیں پڑھا کرتا

وہ اپنے عہد کی سچائیوں کا دشمن ہے
جو گیت پڑھتا ہے نالے نہیں پڑھا کرتا

میں زندگی کا مظفرؔ مطالعہ بھی کروں
فقط کتابیں، رسالے نہیں پڑھا کرتا



○

زندہ رہنا ہے تو غیرت کو سوالی نہ کرو
زندگی دِن کے اُجالے میں تو کالی نہ کرو

سوچنا چھوڑ دیا تُم نے تو مر جاؤ گے
ذہن تو رُوح کا گھر ہے اسے خالی نہ کرو

دینے والے نے تمھیں بھی تو زبانیں دی ہیں
اپنے لہجے میں کہو بات، جگالی نہ کرو

ہم تو پہلے ہی بہت بکھرے ہُوئے رہتے ہیں
بات ہم سے کوئی دِل توڑنے والی نہ کرو

دیا جاتا ہے جو لالچ تمھیں اِمداد دِل کا
مُدعا یہ ہے کہ تدبیر بحالی نہ کرو

دُشمنِ جاں تمھیں کمزور سمجھنے نہ لگے
اِس قدر تذکرۂ خیر سگالی نہ کرو

کوئی پابندی لگے گی نہ مظفرؔ تم پر
ایک بس خواہشِ آزاد خیالی نہ کرو



رات کو اور بھی گنجان کیا جاتا ہے
صبح ہونے کا بھی اعلان کیا جاتا ہے

جھوٹ کو تختِ صداقت پہ بٹھانے کے لیے
عدل کو جرم پہ قربان کیا جاتا ہے

ظلم بھی کرتے ہیں اس دور کے ظالم ایسے
جیسے مجبور پہ احسان کیا جاتا ہے

وحشتیں باندھ کے رکھتے ہیں گرہ میں اپنی
چاک اوروں کا گریبان کیا جاتا ہے

حلقۂ کفر میں تبلیغ نہیں کی جاتی
اہلِ ایماں کو مسلمان کیا جاتا ہے

رکھی جاتی ہے تباہی پہ بنائے تعمیر
امن سے وعدۂ بحران کیا جاتا ہے

دونوں آنکھوں کو مخالف کی بجھانے کے لیے
اپنی ایک آنکھ کا نقصان کیا جاتا ہے

ہر سخنور کو کیا جاتا ہے پابندِ سکوت
اور تقریر کے دوران کیا جاتا ہے

مبتلا کر کے مظفرؔ بڑی دشواری میں
چھوٹی دشواری کو آسان کیا جاتا ہے



جو دانشور سمجھدار آدمی ہیں
وہ اس دنیا کے بیکار آدمی ہیں

کسی طوفان نے مجھ کو نہ روکا
مرے رستے کی دیوار آدمی ہیں

سرِ آبِ رواں چہرے بناؤں
اِدھر ہیں اور نہ اُس پار آدمی ہیں

چھری سے گدگدا لیں، ہرج کیا ہے
محبت کیش ہیں یار آدمی ہیں

بھرا رہتا تھا دسترخوان اُس کا
جنازے میں فقط چار آدمی ہیں

شرف ہے جن کا کھل کر بات کرنا
وہی مخفیہ پُر اسرار آدمی ہیں

شرافت کا تماشہ ہو رہا ہے
پسِ کردار خونخوار آدمی ہیں

بدن زخموں سے چھلنی ہے مظفرؔ
بڑے ظالم ملنسار آدمی ہیں



روئے بغیر ربط و روانی کہاں سے لاؤں
آنسو نہ جس میں ہوں وہ کہانی کہاں سے لاؤں

نقطے سے ہیں پڑے ہوئے سارے وجود پر
بے حرف زندگی میں معانی کہاں سے لاؤں

تازہ گلاب جس میں رکھے تھے بہار نے
وہ عمر کی کتاب پرانی کہاں سے لاؤں

خود کو بھی دے رہا ہوں صدا تیرے نام سے
میں بے نشاں ہوں کوئی نشانی کہاں سے لاؤں

کھل کر دکھاؤں سوکھے ہوئے دل سے کس طرح
چاروں طرف تو پیاس ہے پانی کہاں سے لاؤں

شعلوں سے کس طرح میں چھڑاؤں ہواؤں کو
جلتی رتوں میں شام سہانی کہاں سے لاؤں

ہونا تھا جس کا مجھ کو مظفرؔ میں ہو چکا
اب اختیارِ نقلِ مکانی کہاں سے لاؤں



ترے لب پہ نام میرا، مرے بعد تک رہے گا
ترے گھر میں یہ لیٹرا مرے بعد تک رہے گا

ادھر آئیں اپنی آنکھیں ترے جسم پر سجا دوں
مری زد میں حسن تیرا مرے بعد تک رہے گا

جہاں زندگی چلے گی مری بات بھی چلے گی
مری رات کا سویرا مرے بعد تک رہے گا

تو ہوا کو اپنے حق میں نہیں کر سکے گا پگلے
مرے خون کا پھریرا مرے بعد تک رہے گا

مری خاکِ آرزو سے نئے سر پھرے اٹھیں گے
یہ قلندروں کا ڈیرا مرے بعد تک رہے گا

کبھی گُل نہ ہونے دینا مرے حرف میرے نغمے
کہ یہ ظلم کا اندھیرا مرے بعد تک رہے گا

میں ہر اک دیئے کی لَو ہوں میں اسیرِ عہدِ نو ہوں
مرے اِرد گرد گھیرا مرے بعد تک رہے گا

یونہی گونجتا رہوں گا میں گلی گلی مظفرؔ
مرا شہر شہر پھیرا مرے بعد تک رہے گا



پھول کھلتے ہیں اور باس آتی نہیں
مسکراہٹ ہمیں راس آتی نہیں

کتنی ظالم ہے محبوبہ زندگی
لاکھ اشارے کرو پاس آتی نہیں

اُس کے نزدیک پانی کی قیمت ہی کیا
جس کے ہونٹوں تلک پیاس آتی نہیں

نام قاتل کا کیسے بتائے لہو
عکس میں شکل عکاس آتی نہیں

وقف، حسنِ سماعت ہے اُن کے لیے
جن کو آوازِ احساس آتی نہیں

کیا ہو اُن سے مظفرؔ امیدِ وفا
دلدلوں پر کبھی گھاس آتی نہیں

ہونٹ جلتے ہیں تو دامن کو بھگو لیتا ہوں
پیاس لگتی ہے تو جی کھول کے رو لیتا ہوں

زندگی حق ہے کسی کا جو ادا کرنا ہے
قرض لگتا ہے مجھے سانس بھی جو لیتا ہوں

نیند بھی جاگتی رہتی ہے مری آنکھوں میں
دل کا دروازہ کھلا چھوڑ کے سو لیتا ہوں

کبھی گہرائیاں بھی میری مدد کرتی ہیں
پار اترنے کے لیے ناؤ ڈبو لیتا ہوں

ہنسنے لگتا ہوں تو بھر آتی ہیں آنکھیں میری
پھول کھلتے ہیں تو کانٹوں میں پرو لیتا ہوں

ایک آنسو بھی زمیں پر نہیں گرنے دیتا
اپنی ہی اڑتی ہوئی خاک میں بو لیتا ہوں

بار احساس اٹھایا ہے مظفرؔ اتنا
اب تو حالات کے کہسار بھی ڈھو لیتا ہوں



ٹوٹ جانا تھا دل اک کھلونا ہی تھا یہ تو ہونا ہی تھا
درد کی سیج پر ہم کو سونا ہی تھا یہ تو ہونا ہی تھا

کتنی معصومیت سے لگاتے رہے ہم حسیں قہقہے
قہقہوں کے نتیجے میں رونا ہی تھا یہ تو ہونا ہی تھا

چھڑ گئے ہجر و تنہائی کے سلسلے تم ہمیں کیا ملے
ہم کو خود اپنے ہاتھوں سے کھونا ہی تھا یہ تو ہونا ہی تھا

ہم سخنور بھی لفظوں کے مزدور ہیں فکر سے چور ہیں
بوجھ کوئی نہ کوئی تو ڈھونا ہی تھا یہ تو ہونا ہی تھا

ہاتھ آنکھوں پہ آیا نہ دامن ملا کیسا جیون ملا
آنسوؤں کو بھی مٹی میں بونا ہی تھا یہ تو ہونا ہی تھا

ساری طغیانیوں سے گزرتے رہے پار اترتے رہے
ساحلوں نے بھی اک دن ڈبونا ہی تھا یہ تو ہونا ہی تھا

خون کی آخری بوند تک بہہ گئی لاج تو رہ گئی
سر تو نیزے میں اس نے پرونا ہی تھا یہ تو ہونا ہی تھا

گھر سے اٹھے مظفرؔ یہاں آگئے لوگ دفنا گئے
قبر کا چوکھٹا بھی بچھونا ہی تھا یہ تو ہونا ہی تھا

○

اپنی ذات کو اپنے ذہن میں کھینچے پھرتا ہے
ہر کوئی اپنے گرد فصیلیں کھینچے پھرتا ہے

دیواروں پر اپنا سایہ بھی نہیں پڑنے دیتا
اوروں کی ننگی تصویریں کھینچے پھرتا ہے

ہر طاقتور کو اپنے بارے میں ہے یہ خوش فہمی
جیسے وہی دھرتی کی طنابیں کھینچے پھرتا ہے

تاریکی میں دیکھ لیا ہو گا کوئی چاند سا چہرہ
اک دیوانہ رات کی زلفیں کھینچے پھرتا ہے

ساتھ نہ دینے والے وقت کے پیچھے بھاگنے والا
ہاتھ نہ آنے والی باہیں کھینچے پھرتا ہے

کوئی بھی سیدھی سمت میں جاتا نہیں دکھائی دیتا
جانے کس کی کون مہاریں کھینچے پھرتا ہے

اس قبرستانی بستی میں ہے جو شخص بھی زندہ
وہ اپنے حصے کی لاشیں کھینچے پھرتا ہے

موت بھی جانے کتنی بار مظفرؔ کو آئے گی
ایک اکیلا کتنی صلیبیں کھینچے پھرتا ہے



دلِ شکستہ، نہ رو بار بار، چپ ہو جا
چھری سے تیز ہے اشکوں کی دھار، چپ ہو جا

سمندروں کا سمندر ہے آنکھ کے پیچھے
نہ کر سکے گا کبھی اس کو پار، چپ ہو جا

جو آج تلخ نوائی کی داد دیتے ہیں
کریں گے کل وہ تجھے سنگسار، چپ ہو جا

پھٹی پھٹی ہوئی آنکھوں پہ احتجاج نہ کر
یہاں تو جسم بھی ہیں تار تار، چپ ہو جا

ہر ایک شخص کا حسنِ سلوک کہتا ہے
کسی کی سن نہ کسی کو پکار، چپ ہو جا

جو منصفوں کے جرائم کی بات کی میں نے
عدالتوں سے صدا آئی، یار چپ ہو جا

کبھی سکوت بھی پتھر کی طرح لگتا ہے
نکالنا ہے جو دل کا غبار چپ ہو جا

ترے دکھوں کا مظفرؔ نہ بھید کھل جائے
لگا نہ قہقہے دیوانہ وار، چپ ہو جا



ہر لفظ دکھ کے ساتھ ادا کر رہا ہوں میں
جرمانۂ حیات ادا کر رہا ہوں میں

بے وجہ تو نہیں مرے ہونٹوں پہ قہقہے
ہر زخم کی زکوٰۃ ادا کر رہا ہوں میں

خواہش تو آج تک کوئی پوری نہیں ہوئی
محصولِ خواہشات ادا کر رہا ہوں میں

میں نے تو کچھ بھی تجھ سے زمانے لیا نہیں
پھر کیسے واجبات ادا کر رہا ہوں میں

اتنا تو واسطہ بھی نہیں اپنی ذات سے
جتنا خراجِ ذات ادا کر رہا ہوں میں

احباب تاجروں کی طرح ملنے لگ گئے
قرضِ تعلقات ادا کر رہا ہوں میں

زندہ دکھائی دیتا ہوں جی تو نہیں رہا
بیعانۂ وفات ادا کر رہا ہوں میں

ہر سانس کٹ رہا ہے مظفرؔ جہاد میں
تلوار پر صلوٰۃ ادا کر رہا ہوں میں



لہو پی کر، شرابی ہو گیا ہے
زمانہ، انقلابی ہو گیا ہے

پڑھیں گی کتنے انسانوں کو آنکھیں
ہر اک چہرہ کتابی ہو گیا ہے

بڑھاپا آگیا تہذیب پر بھی
تمدن بھی خضابی ہو گیا ہے

سیاہی پھیر دو سب آئنوں پر
لیڈرا، احتسابی ہو گیا ہے

جنہیں تھی فکرِ تعمیرِ زمانہ
انہیں شوقِ خرابی ہو گیا ہے

اچھالا جا رہا ہے خون کس کا
کہ ہر منظر گلابی ہو گیا ہے

تڑپتا ہوں تو کھل جاتی ہیں سانسیں
سکوں بھی اضطرابی ہو گیا ہے

دکھا کر آگ ، دیکھیں سب تماشہ
مظفر ماہتابی ہو گیا ہے



دل کی دھڑکن سے بھی مہنگا دیدۂ بینا پڑا
موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا پڑا

پتھروں کے ساتھ ہم سر اپنا ٹکراتے رہے
اور اُس کا ہر قدم آئینہ آئینہ پڑا

اپنی چیخوں کا ہوا کتنا حسیں ردِّ عمل
جس طرف سے بھی گئے رستے میں سازینہ پڑا

ہم نے ہر اک سانس پر مرنے کی عادت ڈال لی
خود ہی قبریں بھی بنائیں خود کفن سینا پڑا

ہاں مظفرؔ ہم بھی اپنے عہد کے سقراط تھے
دوست بھی کوئی نہیں تھا زہر بھی پینا پڑا



دیکھ کے چلنا اے دِل پیچھے
رستہ ہے آگے منزل پیچھے

مَوت محافظ زندگیوں کی
لاکھ لگا ہو قاتل پیچھے

جب طوفان اٹھیں سینے میں
رہ جاتے ہیں ساحل پیچھے

یہ ہر دَور کی رِیت رہی ہے
جاہل آگے قابل پیچھے

جُرم نہ کرنے والوں کے بھی
پڑ جاتے ہیں عادل پیچھے

ہم اُٹھ تو آتے ہیں مظفرؔ
اُجڑ نہ جاتے محفل پیچھے



آئنے اپنی جگہ، بے چہرگی اپنی جگہ
دل میں دنیا کے بنائے ہر کوئی اپنی جگہ

عشق کی منزل کے دونوں خوبصورت راستے
خلوتیں اپنی جگہ آوارگی اپنی جگہ

دونوں لہجے منفرد ہیں گفتگو کے واسطے
چیخ کا اپنا تصور، خامشی اپنی جگہ

زلزلوں نے اپنے ہاتھوں سے مری تعمیر کی
منتشر ہو کر بھی ہر اک چیز تھی اپنی جگہ

شعلہ و شبنم کے سنگم کا سفر ہے زندگی
دھوپ کی اپنی حرارت چاندنی اپنی جگہ

صبح کا تارہ بھی پھوٹے رات کی گہرائی سے
ایک مُخفیہ زندگی ہے موت بھی اپنی جگہ

چلتے چلتے ہم جہاں تھک کر مظفرؔ گر پڑے
وہی اپنا شہر کہلایا وہی اپنی جگہ



ستارہ بن کے طلوعِ سحر تک آیا تھا
میں اُس سے مل نہ سکا وہ تو گھر تک آیا تھا

پھر اُس کے بعد سُلگتا رہا تمام وجود
بس ایک شعلہ لپک کر نظر تک آیا تھا

سماعتیں بھی مری ساتھ لے گیا اپنے
جو آہٹوں کی طرح رہگزر تک آیا تھا

اُسی نے نوچ لیے ہوں گے پھول پھل سارے
ہوا کا بازوئے نحیفہ شجر تک آیا تھا

ابھی سے توڑ دی امید ناخدا تو نے
ابھی تو اپنا سفینہ بھنور تک آیا تھا

یہ سرخروئی یقیناً اُسی کا احساں ہے
جو ایک پیار بھرا سنگ سر تک آیا تھا

مظفرؔ اپنی زمیں پاؤں نے نہیں چھوڑی
اگرچہ شہر میں پانی کمر تک آیا تھا



ظلم منظور، رعایت نہیں مانگی جاتی
زندہ رہنے کی اجازت نہیں مانگی جاتی

ہم تو بازار میں بکنے کے لیے آئے تھے
آپ کو دیکھ کے قیمت نہیں مانگی جاتی

ہاتھ پھیلانے کے آداب سے ناواقف ہیں
ہم سے محنت کی بھی اُجرت نہیں مانگی جاتی

دیدہ و دل ہی نہیں جاں بھی نچھاور کر کے
قرض کی طرح محبت نہیں مانگی جاتی

بھیک امداد کے پیرائے میں مل سکتی ہے
لیکن امداد میں غیرت نہیں مانگی جاتی

اپنا چہرہ ہی مزین ہو اگر داغوں سے
آئینوں سے تو وضاحت نہیں مانگی جاتی

سانس لینا بھی ہے دشوار مگر کیا کیجے
مرتے مرتے بھی قیامت نہیں مانگی جاتی

رحمدل لوگ بھی ہیں اب تو مظفرؔ غاصب
حق تو پھر حق ہے امانت نہیں مانگی جاتی



میں راہ کی کسی دیوار سے نہیں ڈرتا
جو سر اٹھا کے چلے، دار سے نہیں ڈرتا

تبسّموں کا تو عاشق ہوں تمکنت کا نہیں
کلی سے ڈرتا ہوں تلوار سے نہیں ڈرتا

پھٹے لباس میں آئے کوئی تو کانپ اُٹھوں
امیرِ شہر کی دستار سے نہیں ڈرتا

اَنا کی چھوٹی سی اک جھونپڑی میں رہتا ہوں
کسی محل کسی دربار سے نہیں ڈرتا

مرے وجود میں کچھ اتنی ٹوٹ پھوٹ ہوئی
کہ زلزلوں کی بھی رفتار سے نہیں ڈرتا

کھنکتے کے ہوں تلوار ہو کہ زنجیریں
میں نغمہ گر کسی جھنکار سے نہیں ڈرتا

تمام عمر یہی زہر میں نے چاٹا ہے
میں سچی بات کے اظہار سے نہیں ڈرتا

اسی لیے ہے مظفرؔ مرا لہو ارزاں
کہ میں گرانیِ بازار سے نہیں ڈرتا

○

رہ نما ہیں یہ مسند پہ بیٹھے ہوئے
یا مجاور ہیں مرقد پہ بیٹھے ہوئے

ظلم پہ ہاتھ کوئی نہیں ڈالتا
بے ضرر لوگ ہیں زد پہ بیٹھے ہوئے

بے وفاؤں کو آواز دیتے رہیں
ہم محبت کی سرحد پہ بیٹھے ہوئے

طائرِ آرزو کو زمانہ ہوا
وقت کے بوڑھے برگد پہ بیٹھے ہوئے

پاؤں سے جب خدا نے زمیں کھینچ لی
منہ کے بل گر پڑے قد پہ بیٹھے ہوئے

ہر نظر کی حقارت کے حقدار ہیں
جو ہیں تختِ خوشامد پہ بیٹھے ہوئے

سازشیں کر رہی ہے مظفرؔ ہوا
پَر کٹے بھی ہیں گنبد پہ بیٹھے ہوئے

(۱)

وقت سے ہم نے قرضِ تعاون لیا
زندگی نے دکھوں کے لیے چُن لیا

پت جھڑوں میں بھی اندر سے کھلتے رہے
زلزلوں سے بھی حُسنِ توازن لیا

کس کی خوشبو نے حدِّ چمن توڑ دی
راہ چلتی ہواؤں نے سر دُھن لیا

اپنے غاروں میں رہنا تھا ہم کو اگر
کیوں زمانے سے رنگِ تمدّن لیا

سازشوں تک پہنچنے کی زحمت نہ کی
جو بھی دیوار نے کہہ دیا، سُن لیا

لمحے لمحے سے ہم جنگ کرتے رہے
دھوپ سے چھاؤں لی، پاپ سے پُن لیا

دیکھنی تھی مظفرؔ یہ دنیا ہمیں
جال آنکھوں کا چاروں طرف بُن لیا



فضاؤں کی دہائی دے رہی ہیں
ہوائیں بھی سنائی دے رہی ہیں

نظر کے سامنے کون آ گیا ہے
کہ خوشبوئیں دکھائی دے رہی ہیں

مرے حصّے کی ساری کالکیں بھی
قلم کو روشنائی دے رہی ہیں

ہواؤں کی طرح ملتی ہے دنیا
ملاقاتیں، جدائی دے رہی ہیں

میں اپنے دل کا ماتم کر رہا ہوں
تمنائیں بدھائی دے رہی ہیں

مری ہمدرد ہیں کتنی یہ راہیں
دعائے نارسائی دے رہی ہیں

مرے اندر کی بے آواز چیخیں
سزائے خوش نوائی دے رہی ہیں

جنہوں نے مجھ کو چاہا تھا مظفرؔ
وہی آنکھیں برائی دے رہی ہیں



سکوں سے جی رہے تھے، خوئے درد کس نے ڈال دی
ہمارے وجود پہ لکیر زرد کس نے ڈال دی

ہماری آب و تاب پر کسی کا قرض تو نہ تھا
تو پھر ہمارے آئنوں پہ گرد کس نے ڈال دی

شروعِ زندگی سے ہم ذرا خطا پسند تھے
گنہ کے ڈھیر میں ہماری فرد کس نے ڈال دی

رگوں میں بھی مظفر اپنا خون جمنے لگ گیا
ہماری بجلیوں پہ موجِ سرد کس نے ڈال دی



اُڑتے لمحوں پہ دھیان دَھرنے دے
خامشی پر بھی کان دَھرنے دے

زندگی تیرا بوجھ اُٹھانا ہے
پیٹھ پر آسمان دَھرنے دے

روک مت، صاف گوئی سے دُنیا
آگ پر بھی زبان دھرنے دے

پاؤں رکھنا تو در پہ مشکل ہے
جان ہی میری جان دھرنے دے

دے خُدا سب کے غم مظفرؔ کو
دِل میں سارا جہان دَھرنے دے



فسردگی کو مِری شرمسار مت کرنا
جو لے چکا ہُوں وُہ سانسیں شمار مت کرنا

میں اپنے ٹوٹے ہُوئے دِل کے ساتھ بھی خوش ہوں
سہارا دے کے مجھے سوگوار مت کرنا

تمھارے ہوتے ہُوئے ڈھونڈنے چلا ہوں تمھیں
میں پھر مِلوں نہ مِلوں ، اِنتظار مت کرنا

میں کیا کروں مجھے سچ بولنے کی عادت ہے
بُرا لگے تو مِرا اعتبار مت کرنا

سُنا ہے تشنگیاں ساحلوں پہ قابض ہیں
سفر میں رہنا ، سمندر کو پار مت کرنا

اب اپنے دل کی سیاہی کہاں چھپاؤ گے
تمھیں کہا تھا اُجالوں سے پیار مت کرنا

ہُنروروں کی طرف سنگ آتے رہتے ہیں
جواب دو تو دُعا دینا دار مت کرنا

جو اپنی قدر مظفر تمھیں کرانی ہے
تو شکوۂ غمِ لیل و نہار مت کرنا

○

ہم نے بھی آنسوؤں پہ نشیمن بنا لیا
دل کو بغیر آگ کے کندن بنا لیا

اڑتے ہوئے غبار سے صورت تراش لی
آوارہ زندگی کو بجارن بنا لیا

ہم اُس کو دیکھتے رہے اندر کی آنکھ سے
دیوارِ فاصلہ میں بھی روزن بنا لیا

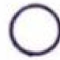
خوشیاں ملیں تو شکر کی جھولی میں ڈال لیں
اور غم ملے تو صبر کو دامن بنا لیا

اپنی رگوں کا خون، فضا میں اُچھال کر
سوکھی ہوئی رتوں کو بھی ساون بنا لیا

ہم اُس کی بے وفائی سے بد دل نہیں ہوئے
ٹوٹی ہوئی امید کو بندھن بنا لیا

ہر ایک دل میں اپنی محبت بکھیر کر
ہم نے ہر ایک شخص کو دشمن بنا لیا

تنہائیوں کو خوب مظفرؔ شکست دی
رستے کو گھر، ہواؤں کو آنگن بنا لیا



میرا ہر ایک درد، شکستہ دلوں کے نام
تنہائیاں بھی اپنی، بھری محفلوں کے نام

ہم جیسے سر پھروں کو بھنور بھی عزیز ہیں
لہروں پہ تم رقم نہ کرو ساحلوں کے نام

دامن پہ لے لیا ہے جنھوں نے مرا لہو
میری محبتیں بھی انھی قاتلوں کے نام

ہر ایک سانس پر مرے قدموں نے لکھ دیئے
رستے بھی جانتے نہیں جن مشکلوں کے نام

کتراؤں حادثاتِ زمانہ سے کس لیے
جب زندگی کو کر دیا مستقبلوں کے نام

منسوب جن سے عدل و صداقت کے سب اصول
ساری دہائیاں بھی اُنھی عادلوں کے نام

اب کچھ بھی میرے پاس منظفرؔ نہیں مرا
سانسیں ہوا کے نام قدم منزلوں کے نام

میں کانٹوں پہ سویا بچھونے سے پہلے
نظر آ گئے خواب سونے سے پہلے

اتارا گیا مجھ کو میرے لہو میں
بہا دی گئی آنکھ رونے سے پہلے

بڑھا دی گئی اور بھی پیاس میری
میں اچھا تھا دامن بھگونے سے پہلے

ہوا کیا، اگر دل کو دنیا نے لوٹا
میں کھیلا ہوں خود اس کھلونے سے پہلے

مذاق اس قدر حوصلوں نے اڑایا
کمر جھک گئی بوجھ ڈھونے سے پہلے

نکالا گیا مجھ کو طغیانیوں سے
کنارے پہ لا کر ڈبونے سے پہلے

پرانے دکھوں کی کٹائی تو کر لو
مظفرؔ نئے زخم بونے سے پہلے



نشیب میں بھی نگاہیں اُٹھان پر رکھنا
قدم زمیں پہ زمیں آسمان پر رکھنا

دہکتی آگ سمجھتے ہو حرفِ حق کو اگر
تو پھر یہ آگ خوشی سے زبان پر رکھنا

اسی غبار سے خوشبو کی لہر آئے گی
تمام بوجھ یقیں کا گمان پر رکھنا

کچھ اپنے آپ بھی کرنا جہت کے اندازے
قدم نہ صرف قدم کے نشان پر رکھنا

جو کوئی خدمتِ تہذیب تم کو کرنی ہے
تو پتیوں کو اُٹھا کر چٹان پر رکھنا

تعلقات ہواؤں سے بھی رہیں لیکن
بھروسہ رکھنا تو اپنی اُڑان پر رکھنا

کسی کو تم سے مظفرؔ نہ کوئی دُکھ پہنچے
تمام بارِ جہاں اپنی جان پر رکھنا



کوئی لمحہ تو مری خیر خبر لے آتا
مری دستار نہ لاتا مرا سر لے آتا

ناخداؤں کے تدبّر نے ڈبویا ہے مجھے
ورنہ کشتی مری ساحل پہ بھنور لے آتا

کچھ ہوتی جو نہ دیوارِ عدالت اُس کی
میں گواہی کے لیے دیدۂ تر لے آتا

کتنے سُقراطِ سماعت مری باتیں سُنتے
زہر سچائی کا ہونٹوں پہ اگر لے آتا

کیا خبر تھی کہ وہ بیچے گا ادائیں اپنی
ہیں کسی عشق کے تاجر کی نظر لے آتا

مری آوارگیوں پر جو نہ بندش ہوتی
راستہ ہاتھ پکڑ کر مجھے گھر لے آتا

روشنی کی، کِسی موسم نے تمنّا ہی نہ کی
وَرنہ ٹوٹا ہُوا تارہ بھی سَحر لے آتا

لوگ دو گام مظفّر کو نہ چلنے دیتے
اپنے ہمراہ اگر زادِ سفر لے آتا



قد اپنی خواہشات کے کم آج بھی نہیں
دستار سے بلند علَم آج بھی نہیں

سچائیوں سے آنکھ ملانے کا حوصلہ
کل بھی نہ تھا خدا کی قسم آج بھی نہیں

حرف و صدا ہیں آج بھی بے بس اسی طرح
آزادیِ زبان و قلم آج بھی نہیں

طے صبح و شام ہو تو رہی ہیں مسافتیں
منزل شناس کوئی قدم آج بھی نہیں

ہونٹوں پہ آج بھی ہیں اذانیں بہت مگر
سینوں میں احترامِ حرم آج بھی نہیں

پہلے بھی ہو رہی تھیں سَرِ عام سازشیں
مخلص خُود اپنے آپ سے ہم آج بھی نہیں

قلاّش تھے متاعِ محبت کے ضمن میں
اور اپنی جیب میں یہ رقم آج بھی نہیں

فردا بھی کیوں کرے گا مظفرؔ ہمیں معاف
صدیوں کے ضائع ہونے کا غم آج بھی نہیں



چلو اب تو انصاف بھی ہو گیا
عدالت سے خونی بری ہو گیا

اجل کارخانوں میں بننے لگی
زمانہ بڑا محنتی ہو گیا

درندوں سے اتنے مراسم رہے
خود اپنے خلاف آدمی ہو گیا

پھر اک حادثے نے بچایا مجھے
قیامت کا دن ملتوی ہو گیا

مرے عہد کی بس یہ تاریخ ہے
گنہگار بھی مدعی ہو گیا

دعا دے رہا ہے ستمگر مجھے
بھکاری بھی کتنا سخی ہو گیا

مظفرؔ کسی کا گلہ کیا کروں
مرا آئنہ اجنبی ہو گیا

○

تشنگی کو فرات پڑھتا ہوں
اپنے مطلب کی بات پڑھتا ہوں

جب کتابوں میں سچ نہیں ملتا
چہرے پڑھتا ہوں ہاتھ پڑھتا ہوں

ہر دکھی شخص کی کہانی میں
اپنے ہی واقعات پڑھتا ہوں

صرف اک بے توجہی اُس کی
میں توجہ کے ساتھ پڑھتا ہوں

کچھ اندھیرے بھی ایسے ہوتے ہیں
میں جنہیں ساری رات پڑھتا ہوں

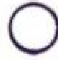
موت سے چھینتا ہوں زندگیاں
میتوں کو برات پڑھتا ہوں

لفظ میرا مذاق اڑاتے ہیں
جب کتابِ حیات پڑھتا ہوں

پاؤں اونچی ہواؤں پر رکھ کر
زلزلوں کو ثبات پڑھتا ہوں

ڈھونڈھنے کے لئے سِرا اپنا
شجرۂ کائنات پڑھتا ہوں

جب مظفرؔ ستائے تنہائی
عشق کی کلیات پڑھتا ہوں



درد کو خوشبوئیں، آنسو کو اُجالے دینا
زخم دینا تو زمانے سے نرالے دینا

رقص کرنے کو بُلایا ہے مجھے کانٹوں نے
میرے پیروں کو بھی رستے ہُوئے چھالے دینا

میں ہُوں انسان، محبت کی ضرورت ہے مجھے
گرتی دیوار سمجھ کر نہ سنبھالے دینا

دُکھ بھی پہنچائیں تو پہنچائیں خُوش اخلاقی سے
مجھ کو دُشمن بھی خدا، چاہنے والے دینا

حرفِ حق کہہ کے بھی احساسِ ندامت ہو جہاں
ایسی دُنیا سے مجھے، میری صدا، لے دینا

اپنی دھرتی دِل و جاں سے بھی ہے پیاری مُجھ کو
اُس کی عادت ہے مگر دیس نکالے دینا

میرے نقّاد کا تنقید بھی کرنا مجُھ پر
اَور میرے ہی اصُولوں کے حوالے دینا

روشنائی تو بھری تُم نے قلم میں کالی
کہیں کاغذ بھی مظفرؔ کو نہ کالے دینا



خامی کو بھی کمالِ نظر، مت کہا کرو
یا فن کو فن، ہُنر کو ہُنر مت کہا کرو

ہر اِک حسیں صدا پہ ٹھہرنا غلط نہیں
لیکن ہر اِک پڑاؤ کو گھر مت کہا کرو

تنہائیاں کسی کی چرانی بھی ہوں اگر
دیوار کے شگاف کو دَر مت کہا کرو

جینے کے واسطے تو ضرُوری ہیں حادثے
لہروں کے ناچنے کو بھنور مت کہا کرو

خُوشیوں میں کر لیا کرو اَوروں کو بھی شریک
ہر اِک سے اپنا دَرد مگر، مت کہا کرو

پھوٹیں جو اپنے ذہن سے کِرنیں تو بات ہے
مانگے کی روشنی کو سحر، مت کہا کرو

کب کوئی چھوڑ جائے مظفرؔ، خبر نہیں
سائے کو بھی شریکِ سفر، مت کہا کرو

○

قہقہوں میں اڑائیں فریادیں — اور ہم کو عدالتیں کیا دیں

ایک دیوانہ ایک سنگ بکف — آدمی کی ہیں دونوں ایجادیں

تو نے شعلے دیئے ہمیں دنیا — ہم تجھے پھول کیسے لوٹا دیں

لوگ غیرت کی پرورش کے لیے — کر رہے ہیں وصول امدادیں

پتھروں کے مکاں بنانے کو — ریت پر رکھ رہے ہیں بنیادیں

اب تو دیوار کے بھی کان نہیں — کیا سنائیں ہم اپنی رودادیں

اپنے فردا کا احترام کرو — مار دو ورنہ اپنی اولادیں

بس مظفرؔ چلے ہمارا اگر
آسماں تک زمیں کو پہنچا دیں



دِل کے ہر ڈوبتے منظر سے گزُر جاتا ہے
وُہ بھی پانی کی طرح سَر سے گزُر جاتا ہے

جب مرے پاؤں تلے روشنیاں ہوتی ہیں
میرا سایہ مِرے اُوپر سے گزُر جاتا ہے

اُس کا احساس دلا دیتی ہے اُس کی خُوشبُو
وُہ تو چُپ چاپ برابر سے گزُر جاتا ہے

میری آواز کے رستے میں نہ حائل ہونا
یہ وُہ شعلہ ہے جو پتھر سے گزُر جاتا ہے

دِل کو یہ عارضۂ صبر بھی تم سے ہی لگا
درد پیاسا ہی سمندر سے گزُر جاتا ہے

وقت کے ساتھ چلا کرتے ہیں قسمت والے
وُہ صدا دیتا ہر اک دَر سے گزُر جاتا ہے

حوصلہ اِتنا ہی کافی ہے مظفؔر کے لِیے
مُسکراتا ہُوا محشر سے گزُر جاتا ہے



ہر توقع امتحاں بنتی گئی
روشنی آتش فشاں بنتی گئی

میرے آنسو خاک میں ملتے گئے
آسماں پہ کہکشاں بنتی گئی

میں حقائق کے لیے لڑتا رہا
زندگی اک داستاں بنتی گئی

یہ سب اُس کے جبر کا احسان تھا
میری خاموشی زباں بنتی گئی

اِتنے خواب آنکھوں میں لے کر چل پڑا
دل پہ تصویر جہاں بنتی گئی

چھوڑ دی جب ساحلوں کی آرزو
موجِ طوفاں، بادباں بنتی گئی

اختلافِ رائے بکنے لگ گیا
آمریّت حکمراں بنتی گئی

کھِل اٹھیں کلیاں مری آواز سے
دیکھ یہ ہے خوشبو دھواں بنتی گئی

دوش کِس کو دوں مظفرؔ موت کا
سانس ہی دیوارِ جاں بنتی گئی



ساری تصویرِ حالات پُرانی ہے
لہجہ صرف نیا ہے بات پُرانی ہے

ناتا اپنا کب ٹوٹا تاریکی سے
روشنیوں کے بھیس میں رات پُرانی ہے

شُعلے اب بھی ہریالی میں رہتے ہیں
موسم تازہ ہے برسات پُرانی ہے

چلتے پھرتے لوگ بھی ہیں پتھرائے ہُوئے
یہ دُنیا تے محسوسات پُرانی ہے

اُندر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھ
چہرہ کچھ بَدلا ہے ذات پُرانی ہَے

جانا چاہیں لوگ نئے دَروازوں سے
اَور دیوارِ امکانات پرانی ہے

باہر کی سانسوں پہ گزارہ ہے اپنا
یہ مقروضہ نہ خیرات پرانی ہے

اوڑھ بھی لے وُہ جِسم نیا تو کیا حاصل
رُوح مظفّر جس کے ساتھ پرانی ہے



جو تیری راہگزر کی طرف بھی جاتا ہے
وہ ناؤ لے کے بھنور کی طرف بھی جاتا ہے

پڑیں جو پاؤں میں چھالے، دماغ میں پھوٹیں
اُڑے غبار تو سر کی طرف بھی جاتا ہے

میں صرف خنجرِ قاتل پہ کیوں تلاش کروں
لہو تو دیدۂ تر کی طرف بھی جاتا ہے

جو شام ہوتے ہی قبضہ کرے فضاؤں پر
وہی اندھیرا سحر کی طرف بھی جاتا ہے

ہوا کے ہاتھ نہ لگ جائیں میرے اندیشے
کہ یہ سکوت خبر کی طرف بھی جاتا ہے

مسافرانِ عدم کو میں جب بھی دیکھتا ہوں
تو دھیان رختِ سفر کی طرف بھی جاتا ہے

ترے پڑاؤ بھی جس راستے میں پڑتے ہیں
وہ راستہ مرے گھر کی طرف بھی جاتا ہے

کبھی خدا سے مظفرؔ نہیں ہوا مایوس
یہ سنگ کھا کے ثمر کی طرف بھی جاتا ہے



یہ کیا مذاق گردشِ حالات نے کیا
شعلوں کا ہمسفر مجھے برسات نے کیا

خنجر چلا گئی مرے سینے پہ چاندنی
زخموں سے چور تاروں بھری رات نے کیا

کس نے چراغ چھین لیے میرے ہاتھ سے
گمراہ مجھ کو کس کی ہدایات نے کیا

یہ سلطنت ملی ہے اُسے رائے مانگ کر
اس کو امیرِ شہر بھی خیرات نے کیا

تنقید کر رہا ہے وہی میرے ذہن پہ
جس کو حسین میرے خیالات نے کیا

ماضی ہے لاشعور تو فردا مرا شعور
مجھ کو جدید میری روایات نے کیا

قتلِ ہمیشہ سے ہے انصاف بے خبر
قانون جانتا ہے کہ کس ہات نے کیا

کرتی ہیں اب تو جرم مظفرؔ عدالتیں
باغی مجھے بھی ایسے تضادات نے کیا



وقت ہم کو، جانے کیا سمجھا گیا
سائے کو بھی آئنہ سمجھا گیا

عزتوں تک کیا پہنچتی زندگی
ٹھوکروں کو راستہ سمجھا گیا

پاگلوں نے پرورش کی عقل کی
بے حِسی کو مامتا سمجھا گیا

ختم اُسی دن ہو گیا تھا آدمی
ظالموں کو جب خدا سمجھا گیا

خون کی بو کیوں نہ آئے خاک سے
قاتلوں کو رہ نما سمجھا گیا

جرم نے ہتھیا لیا انصاف کو
خون کو ہی خوں بہا سمجھا گیا

جسم پر اوڑھی گئیں عریانیاں
آنکھ کو بندِ قبا سمجھا گیا

موسموں کے ساتھ بھی سازش ہوئی
حبس کو تازہ ہوا سمجھا گیا

سچ کی عادی تھی مظفرؔ کی زباں
اس لیے اس کو بُرا سمجھا گیا



دھن والا کنگال میں زندہ رہتا ہے
دل والا ہر حال میں زندہ رہتا ہے

عشق کو موجِ ساحل راس نہیں آتی
یہ موتی پاتال میں زندہ رہتا ہے

دعوے بڑھتے نہیں زبانوں سے آگے
نعرہ بس پنڈال میں زندہ رہتا ہے

اچھا ہے دل رہے دکھوں کے نرغے میں
یہ مکھیا چوپال میں زندہ رہتا ہے

رہنے کو تو خوش اخلاق درندہ بھی
انسانوں کی کھال میں زندہ رہتا ہے

تیز ہوا پر شعلۂ حق لکھنے والا
صدیوں کے اعمال میں زندہ رہتا ہے

آنسو زخم کو اور ہرا کر دیتے ہیں
غم پانی کے جال میں زندہ رہتا ہے

زندہ رہوں گا میں بھی مظفرؔ یوں جیسے
ہر لمحہ گھڑیال میں زندہ رہتا ہے



رات کے داغ مٹانے ہوں گے
دھوپ میں دیپ جلانے ہوں گے

جمع کرتے رہو لمحہ لمحہ
کبھی دامن میں زمانے ہوں گے

ہاتھ میں سنگ اٹھا کر نہ چلو
راہ میں آئنہ خانے ہوں گے

اپنی گہرائیوں کو فتح کرو
مٹھیوں میں بھی خزانے ہوں گے

جتنی بیدار رہیں گی آنکھیں
خواب اُتنے ہی سہانے ہوں گے

بے ارادہ جو محبت کی ہے
بے طلب زخم بھی کھانے ہوں گے

ٹوٹ کر پیار وطن سے کرنا
ورنہ کاندھوں پہ ٹھکانے ہوں گے

نئی دنیا نہ قبولے گی ہمیں
اگر انداز پرانے ہوں گے

شوق، منزل کا مظفرؔ ہے اگر
راستے خود ہی بنانے ہوں گے

○

رگوں میں خون کے گرداب دیکھنے کے لیے
میں غرق ہو گیا سیلاب دیکھنے کے لیے

کبھی پہننی پڑیں خوشبوئیں کبھی شعلے
ہوائے شہر کے آداب دیکھنے کے لیے

تمام عمر کی نیندیں اجاڑ لیں میں نے
کوئی نہ دیکھا ہوا خواب دیکھنے کے لیے

ابھی تو قتل کا میرے تماشہ ہونا ہے
ابھی سے جمع ہیں احباب، دیکھنے کے لیے

بجھا دیا گیا رستے کے سب چراغوں کو
بس اک سواریِ مہتاب دیکھنے کے لیے

وہ ہے عظیم تو کیوں، منفرد ہے تو کیسے
ترس گیا، پرِ سرخاب دیکھنے کے لیے

محبتوں میں گرفتار کرتی رہتی ہے
یہ زندگی مجھے بیتاب دیکھنے کے لیے

مظفرؔ اپنا بدن تار تار کر ڈالا
کسی کے ہاتھ میں مضراب دیکھنے کے لیے

بجھا دیا گیا رستے کے سب چراغوں کو
بس اک سواریِ مہتاب دیکھنے کے لیے

وہ ہے عظیم تو کیوں، منفرد ہے تو کیسے
ترس گیا، پرِ سرخاب دیکھنے کے لیے

محبتوں میں گرفتار کرتی رہتی ہے
یہ زندگی مجھے بیتاب دیکھنے کے لیے

مظفرؔ اپنا بدن تار تار کر ڈالا
کسی کے ہاتھ میں مضراب دیکھنے کے لیے



مجھے بھی تحویلِ چاہ میں دے دیا گیا ہے
بہت حسیں قتل گاہ میں دے دیا گیا ہے

نگاہ چہرے سے دور رکھنے کا عہد لے کر
حصارِ زلفِ سیاہ میں دے دیا گیا ہے

دکھا دی آغاز ہی میں انجام کی تباہی
سراغ منزل کا، راہ میں دے دیا گیا ہے

جہاد پر میں چلا تھا لیکن مجھے پکڑ کر
حفاظتِ خانقاہ میں دے دیا گیا ہے

نہیں نہیں کوئی بھی قد آور نہیں ہے ان میں
سروں کو اونچی کلاہ میں دے دیا گیا ہے

شرارتی چند لوگ تھے اور شہر سارا
سپردگیِ سپاہ میں دے دیا گیا ہے

مسلّمہ بے گناہیوں کا مقدمہ بھی
عدالتِ بے گواہ میں دے دیا گیا ہے

ہمیشہ جس کے خلاف لڑتا رہا مظفر
مجھے اُسی کی پناہ میں دے دیا گیا ہے



سانس لینا محال ہے بابا
زندگی کا سوال ہے بابا

ہر گھڑی موت کی حراست میں
زندہ رہنا کمال ہے بابا

چاہنے والے معذرت چاہیں
پیار کا کتنا کال ہے بابا

اپنے دکھ درد تم ہمیں دے دو
یہ غریبوں کا مال ہے بابا

آدمی کا دفاع کر کر کے
آدمیت نڈھال ہے بابا

روشنی، روشنی کی دشمن ہے
ارتقا بھی زوال ہے بابا

کس سخی سے سکونِ دل مانگیں
کون آسودہ حال ہے بابا

کم نہیں محنتی مظفرؔ بھی
خامہ کیا ہے کدال ہے بابا



تسلیوں کی بھی خیرات کون دیتا ہے
کسی کے آنسوؤں کا ساتھ کون دیتا ہے

اگر کوئی مری آنکھوں کا قدر دان نہیں
تو پھر یہ شوقِ ملاقات کون دیتا ہے

ہمارے دن بھی اندھیروں میں قید رہتے ہیں
ہمیں چمکتی ہوئی رات کون دیتا ہے

یہ چھیننے کا زمانہ ہے مانگنے کا نہیں
حقوق ہوں کہ مُراعات کون دیتا ہے

خزانہ درد کو کہدو تو لوٹ لیتے ہیں
سکونِ قلب کی سوغات کون دیتا ہے

عدالتیں نہیں قانون کی دکانیں ہیں
بکے بغیر بیانات کون دیتا ہے

بجائی جاتی ہیں چیخوں کی لے پہ بانسریاں
سلگنے والوں کو برسات کون دیتا ہے

دھکیل دیتے ہیں کچھ اور، گرنے والوں کو
کسی کے ہاتھ میں اب ہاتھ کون دیتا ہے

برابری کے مظفرؔ اگر ہیں سب قائل
تو پھر یہ تحفۂ طبقات کون دیتا ہے



کسی جواب کا حق اُس کے پیار نے نہ دیا
لہو بہا تو لہو کو پکارنے نہ دیا

سجائی ہوں گی فضائیں کھلائے ہونگے چمن
ہمیں تو ایک تبسم بہار نے نہ دیا

غمِ جہاں کا یہ احسان ہم پہ کیا کم ہے
کہ ایک پل بھی سکوں سے گزارنے نہ دیا

کسی کے سر پہ رکھے آسمان، دنیا نے
کسی کو پاؤں زمیں پہ اُتارنے نہ دیا

کچھ ایسا شوقِ فتوحات تو نہ تھا مجھ کو
شکستہ پن نے مرے مجھ کو ہارنے نہ دیا

اُچھالتی رہی پتھر، مری طرف دنیا
مجھے ہواؤں کا جھونکا بھی مارنے نہ دیا

حدوں سے اُس کی نکلنے کا راستہ مجھ کو
مرے ہی دائرۂ اختیار نے نہ دیا

جو دشمنوں سے مظفرؔ ہوا نصیب مجھے
وہ اعتماد کسی غمگسار نے نہ دیا



دل کی دھڑکن سزا ہو گئی
ظلم کی انتہا ہو گئی

بندگی کا رواج اُٹھ گیا
آدمیّت، خدا ہو گئی

نیتوں کا بھرم کھل گیا
ہر دعا، بد دعا ہو گئی

لُٹ گئے ہم تو ایسے لگا
جیسے قیمت ادا ہو گئی

عدل کو چھوڑ کر، عدلیہ
جرم کی داشتہ ہو گئی

لوگ آپس میں جلنے لگے
ساری خوشبو ہوا ہو گئی

اصلیت کو نہ اب ڈھونڈیئے
وہ بھی بہروپیا ہو گئی

حیرتیں جم گئیں آنکھ میں
زندگی کیا سے۔ کیا ہو گئی

شہر کیا سب کا سب جل گیا
بانسری بے صدا ہو گئی

سچ مظفرؔ نے کیا کہہ دیا
اک قیامت بپا ہو گئی

ظلم چاہے کہیں ہو کسی پر بھی ہو، خون روتا ہوں میں
زخم چاہے کسی کے بدن پر لگے، قتل ہوتا ہوں میں

میری گردن میں ہر ایک کا طوق ہے، یہ مرا شوق ہے
اپنی ہر سانس میں ہر دکھی شخص کے، دکھ پروتا ہوں میں

سب کا دل میرے جذبات کے پاس ہے، مجھ کو احساس ہے
اپنے پیروں میں نکلے ہوئے خار بھی خود چبھوتا ہوں میں

اک پتنگے کی صورت پھرے زندگی، روشنی روشنی
اپنی دیوارِ جاں پر ہر اک سامنے کا، بوجھ ڈھوتا ہوں میں

بھاگتا اس قدر ہوں کہ ہر رہگزر ، لگتی ہے ہمسفر
جاگتا اس قدر ہوں کہ شعلوں پہ بھی سکھ سے سوتا ہو نہیں

مانتا ہوں مظفر خدا کی زمیں اتنی بنجر نہیں
فصلِ امن و سکوں کاٹنے کے لیے درد بوتا ہوں میں



صبح کو کیا پہچانے جائیں شام کے لوگ
بستی بستی بے چہرہ، بے نام کے لوگ

جسموں پر عریانی باندھے پھرتے ہیں
چادر کے شوقین، نہ اب احرام کے لوگ

ہم کشتی میں بیٹھے ڈرتے رہتے ہیں
پار اتر جاتے ہیں، لہریں تھام کے لوگ

اپنے لیے تو ہر کوئی جی لیتا ہے
کسی کے کام نہ آئیں تو کس کام کے لوگ

کریں مظفرؔ دوستیاں بھونچالوں سے
اور خدا سے طالب، استحکام کے لوگ



ایسے بھی تو قاتل ہیں جو خون نہیں کرتے
احسان تو کرتے ہیں ممنون نہیں کرتے

منصف ہیں عدالت میں مجرم کی حراست میں
خود اپنی وکالت بھی، قانون نہیں کرتے

کچھ ہم کو بھی مل جاتی، خیرات محبت کی
عذرِ تہی دامانی، قارون نہیں کرتے

تلخی ہے تبسم میں، یہ نقص ہے کیوں تم میں
عنوان سے غداری، مضمون نہیں کرتے



جہاں سب سنگدل ہوں، چشمِ تر سے کچھ نہیں ہوتا
پہاڑوں پر گھٹا کتنی ہی برسے، کچھ نہیں ہوتا

بہاروں، پت جھڑوں کا رابطہ اندر سے ہوتا ہے
چمن میں ہو کہ ویرانے میں، گھر سے کچھ نہیں ہوتا

اگر بیمار ہی اچھا نہ ہونے کی قسم کھا لے
تو پھر اچھے سے اچھے چارہ گر سے کچھ نہیں ہوتا

صداقت کو کبھی تشہیر کی عادت نہیں پڑتی
عمل سے بات بنتی ہے خبر سے کچھ نہیں ہوتا

اندھیرے، صرف باہر کے اُجالوں سے نہیں مٹتے
لہو جب تک نہ ہو روشن، سحر سے کچھ نہیں ہوتا

دکھاؤں آئنہ کس کو، چڑھے ہیں خول چہروں پر
نہ ہو جب حسن ہی، حسنِ نظر سے کچھ نہیں ہوتا

مظفرؔ جبر سے نیکی جنم لیتے نہیں دیکھی
محاذِ عشق پر، تیغ و تبر سے کچھ نہیں ہوتا



طلب حیات کی اُس وقت تک نہیں جاتی
بدن کے جام سے جب تک چھلک نہیں جاتی
اسی لیے مجھے ظالم نے توڑ ڈالا ہے
کہ ریزہ ریزہ ہوں پھر بھی کھنک نہیں جاتی
کچھ ایسی مالکِ ہوش و حواس ہے دنیا
کسی کا خون بھی پی کر بہک نہیں جاتی
ہوا دُشکر کرو آگ ہے مرے اندر
مگر یہ تم سے لپٹ کر بھڑک نہیں جاتی
تم اپنے قتل کا خود ہی گواہ چھوڑ گئے
مرے لہو سے تمہاری مہک نہیں جاتی
نظر سے گزرے ہیں چہرے ہزار ہا لیکن
اس آئنے سے تمہاری جھلک نہیں جاتی
خفا ہیں اہلِ سخن اس لیے مظفر سے
کہ کیوں یہ دکھ بھری آواز تھک نہیں جاتی



نشانے پر بھی رہے زد مگر نہیں پڑتی
نگاہِ عشق کسی عیب پر نہیں پڑتی

چلو تصورِ جاناں کی سیر کر آئیں
کہ اِس سفر میں کوئی رہگزر نہیں پڑتی

جو شخص اپنی ہی حیرانیوں میں رہتا ہو
اُسے ضرورتِ آئینہ گر نہیں پڑتی

میں دم بخود رہوں یا قہقہے لگاتا رہوں
کسی معاملے میں چشمِ تر نہیں پڑتی

شبِ سیاہ تو چپ ہے فضاؤ تم ہی بتاؤ
ہمارے راستے میں کیا سحر نہیں پڑتی

ہنرورِ دل پہ مظفرؔ ہم اعتراض کریں
اور اپنی کم نظری پر نظر نہیں پڑتی



کچھ خوشیاں کچھ آنسو کچھ حیرانی ہوتی ہے
ہر انسان کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے

جھوٹی محبت ہی تم آنکھوں میں لے کر آجانا
زہر پیالہ پینے میں آسانی ہوتی ہے

اپنی آوازوں کے خول چڑھا لیتی ہے دنیا
لفظ نئے ہوتے ہیں بات پرانی ہوتی ہے

دل سے دھواں اٹھے تو آنکھ میں آنسو آجاتے ہیں
خون میں لگنے والی آگ بھی پانی ہوتی ہے

ہم جیسا سر پھرنے والا جب کوئی نہیں ہوتا
بازاروں میں بھی کتنی ویرانی ہوتی ہے

دل کے بارے میں ہم عقل سے کچھ نہیں پوچھا کرتے
عقل بہت ہی سنجیدہ دیوانی ہوتی ہے

آرزوؤں کے باغ میں پت جھڑ کا موسم نہیں آتا
دل ہو اگر زندہ ہر عمر سہانی ہوتی ہے

درد کا دریا کوئی مظفرؔ پار تو کر کے دیکھے
ساحل کی لہروں میں بھی طغیانی ہوتی ہے



زہر کو امرت کہو نہ سانپ کو مور کہو
گھر کو بچانا ہے تو چور کو چور کہو

برساتوں سے پانی اگر نہیں لینا
شوق سے پھر اندھیاروں کو گھن گھور کہو

انسانوں کو انساں کہنا جرم نہیں
لیکن آدم خور کو آدم خور کہو

حکم ہے یہ میری بستی کے مالک کا
آگ کو میلہ، سناٹے کو شور کہو

دودھ میں ڈالو اپنے ہاتھ سے مینگھنیاں
گھوسی بیچارے کو ڈانگر ڈھور کہو

قبرستان میں رہنے کا ہے شوق اگر
روح کو میّت کہو بدن کو گور کہو

اہلِ دنیا کو کچھ فرق نہیں پڑتا
گول کہو یا دنیا کو چوکور کہو

لگتا ہے شہتیر، ہمارا تنکا بھی
اور اپنی زنجیروں کو بھی ڈور کہو

بات مظفرؔ پوری کر کے دم لے گا
ضدّی کہو اسے تم یا منہ زور کہو



لہو کو میرے پانی کر رہا ہے
زمانہ چھیڑ خانی کر رہا ہے

سزا بھی مجھ کو یوں دیتا ہے ظالم
کہ جیسے مہربانی کر رہا ہے

نئے رُخ سے محبت کی ہے اُس نے
مگر باتیں پرانی کر رہا ہے

چراغوں کو ہوا کی زد پہ رکھ کر
وہ میری ترجمانی کر رہا ہے

ہر انساں اپنا اپنا نام لے کر
بیاں میری کہانی کر رہا ہے

ستارے ٹانک کر اپنی قبا میں
زمیں کو آسمانی کر رہا ہے

سجا کر آنسوؤں میں اُس کا چہرہ
تصور میزبانی کر رہا ہے

جھکا ہے اُس کے قدموں پر مظفرؔ
قلندر، حکمرانی کر رہا ہے

○

کھڑے ہیں ریت پہ لیکن گلاب مانگتے ہیں
جو نیند بیچ چکے ہیں وہ خواب مانگتے ہیں

کھلی فضاؤں کا حق کس طرح کریں گے ادا
ضمیر سے بھی جو اپنے نقاب مانگتے ہیں

سمندروں پہ ہے قبضہ اب ایسے لوگوں کا
جو ہم سے آنسوؤں کا بھی حساب مانگتے ہیں

ہمیں لگی ہے محبت کی بد دعا شاید
سکونِ دل سے بھی ہم اضطراب مانگتے ہیں

حسین لوگوں کی باتیں بھی کم حسین نہیں
سوال کچھ نہیں کرتے جواب مانگتے ہیں

خود اپنی لاش پہ کیا اُن کو رقص کرنا ہے
جو اپنے خون کے بدلے شراب مانگتے ہیں

ہماری دیدہ دلیری کی داد دی جائے
گناہ کر کے مظفرؔ ثواب مانگتے ہیں

○

شیشہ سی حیات چاہتا ہوں
چہروں سے نجات چاہتا ہوں

جو بھید بتا سکے دلوں کے
ہونٹوں پہ وہ بات چاہتا ہوں

مفہوم کچھ اپنا ڈھونڈھنا ہے
سانسوں کی لغات چاہتا ہوں

ظرفِ شب و روز ہے پرکھنا
پیمانۂ ذات چاہتا ہوں

لمحوں کا حساب رکھنے والے
صدیوں کی زکوٰۃ چاہتا ہوں

میں اپنی فنا کے چار جانب
دیوارِ ثبات چاہتا ہوں

مرنے سے ہی پیشتر مظفرؔ
تاریخِ وفات چاہتا ہوں

○

جرم کا اعتراف کون کرے
بات اپنے خلاف کون کرے

شہر کا شہر ہو اگر قاتل
قتل کا انکشاف کون کرے

فکر ہے اپنے اپنے چہروں کی
گردِ آئینہ صاف کون کرے

کون توڑے غرور خود اپنا
اپنے اندر شگاف کون کرے

دے چکے سب زبان ظالم کو
جرأتِ اختلاف کون کرے

بک گئی ہے زبان منصف کی
بے خطا کو معاف کون کرے

لوگ پرچھائیوں سے ڈرتے ہیں
روشنی کا طواف کون کرے

ہم مظفرؔ ہیں بھیڑ میں تنہا
زحمتِ اعتکاف کون کرے



جس کے دل میں چور، محبت اُس کی ہے
جس کے ہاتھ میں زور، شرافت اُس کی ہے

اُس کا فیصلہ، میں رَد کرنے والا کون
اُس کا ہے قانون، عدالت اُس کی ہے

سر کے گھاؤ، نشانی کمتر لوگوں کی
جو دستار اُچھالے، عزّت اُس کی ہے

مانگے کی زندگیاں بھی کیا زندگیاں
جو ہر سانس خریدے، قیمت اُس کی ہے

اُس کے دریا کا پانی بھی سوکھ نہ جائے
میری تشنہ لبی، ضرورت اُس کی ہے

میں بھی ساری عمر رہا، تنہا تنہا
مجھ سے بھی منسوب، رفاقت اُس کی ہے

ڈھونڈ رہا ہوں میں اُس کو آئینے میں
آئینہ ہی اصل میں صورت اُس کی ہے

جب بھی مظفرؔ کہے گا وہ، لوٹا دوں گا
میری ذات، حیات، امانت اُس کی ہے



اپنی اپنی پیٹھ میں آپ ہی خنجر مار رہے ہیں
جھوٹی جیت کے نام پہ لوگو ہم سب ہار رہے ہیں

جاگتی آنکھوں تو ہم نے لہروں پہ قدم نہ رکھا
اور خوابوں کے دیس میں دریا کے اُس پار رہے ہیں

خول نما چہروں نے آئینوں پر راج کیا ہے
چاند اور سورج جیسے لوگ پسِ دیوار رہے ہیں

کون کسی بڑھیا کی گٹھڑی اٹھا کے اب چلتا ہے
سانس بھی یوں لیتے ہیں جیسے بوجھ اتار رہے ہیں

زخم نہ لگتے تو ہم آج اتنے حساس نہ ہوتے
پتھر مارنے والے بھی ہم کو درکار رہے ہیں

لمحہ لمحہ چیخ رہا ہے آؤ مظفرؔ آؤ
ہم احساس کی قبر پہ بیٹھے وقت گزار رہے ہیں



دھوپ میں اک شجر کی تلاش
یہ ہے بس عمر بھر کی تلاش

آنکھوں آنکھوں مجھے لے گئی
خوبصورت بھنور کی تلاش

حسن کا منتظر آئینہ
آئینے کو نظر کی تلاش

رات کو نیند آتی نہیں
رہے دن بھر سحر کی تلاش

کر رہا ہے نیا آدمی
بستیوں میں کھنڈر کی تلاش

قاتلوں سے محبت مجھے
اور اُنہیں میرے سر کی تلاش

کتنی سچّی ہے آوارگی
گھر میں رہ کر ہے گھر کی تلاش

مشغلہ ہے مظفرؔ مرا
عیب میں بھی ہنر کی تلاش



سراغ اپنا اگر ذات میں نہیں ملتا
تو یہ مشاہدہ خیرات میں نہیں ملتا

سکونِ قلب کی اُمید رکھ نہ شاہوں سے
یہ کوہِ نور محلّات میں نہیں ملتا

سوال اُس سے کس امید پر کیے جاؤں
جواب کوئی بھی اثبات میں نہیں ملتا

یہ تمغہ سینے پہ خود ہی سجانا پڑتا ہے
خدا کا خوف مراعات میں نہیں ملتا

مظفرؔ ایسا کوئی بھی تو کارنامہ نہیں
جو ہم کو اپنی روایات میں نہیں ملتا



یہ کس نے زخم لگائے ہیں خوشبوؤں کی طرح
بدن سے خون ٹپکتا ہے آنسوؤں کی طرح

میں زندگی کے قفس میں بھی رقص کرتا ہوں
کھنکتی رہتی ہے زنجیر گھنگھروؤں کی طرح

یہ کون چھپ کے پریشان کر رہا ہے مجھے
بکھر رہے ہیں خیالات، گیسوؤں کی طرح

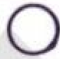
کسی بھی چہرے پہ اصلیتوں کے داغ نہیں
کہ لوگ روپ بدلتے ہیں بہلوؤں کی طرح

جوازِ عدل بھی مجرم خرید لیتے ہیں
گڑی ہوئی ہیں صلیبیں ترازوؤں کی طرح

شرارتوں کی ہی زد پر شرافتیں نہ رہیں
شرافتوں نے بھی لوٹا ہے ڈاکوؤں کی طرح

وہی طلسم اندھیروں کا توڑ سکتے ہیں
جو خود سے روشنی لیتے ہیں جگنوؤں کی طرح

خدا کا شکر مظفر کہ ہو رہی ہے بسر
نہ شاہزادوں کی صورت نہ سادھوؤں کی طرح



عزت، سزا کی طرح، سرِ دار دی گئی
پھندہ گلے میں ڈال کے دستار دی گئی

چاہی تھی ہم نے روشنی مانگا تھا ہم نے گھر
سایا ہمیں کہ گیا دیوار دی گئی

شوقین وہ نہیں تھا اگر قتلِ عام کا
پھر کیوں ہوا کے ہاتھ میں تلوار دی گئی

پانی کے مالکوں نے کیا کس قدر ستم
دریا پہ لا کے تشنہ لبی مار دی گئی

جُرمِ حیات ہم سے ہُوا تھا بس ایک بار
لیکن سزا ئے جُرم لگاتار دی گئی

عُریانیٔ بدن کی قبا میں لپیٹ کر
آوارگیٔ کُوچہ و بازار دی گئی

رکھنا تھا اپنے جہل کی تحویل میں اگر
تعلیم کِس لیے ہمیں سرکار دی گئی

نبٹیں گے حادثاتِ زمانہ سے کس طرح
ہمت بھی اِس جوئے میں اگر ہار دی گئی

روکا عجیب طرح مظفؔر کا راستہ
پَیروں میں سنگ باندھ کے رفتار دی گئی



امن درکار ہے زندگی چاہیے
ہم کو دُنیا محبّت بھری چاہیے

وقت کو ظُلم سے روکنے کے لیے
حوصلہ ہی نہیں زور بھی چاہیے

یہ کوئی پتھروں کا زمانہ نہیں
حسن کا عہد ہے روشنی چاہیے

ہم خُدا تو نہیں جو اکیلے رہیں
آدمی ہیں ہمیں آدمی چاہیے

موت کو جب بھی آنا ہے آ جائے گی
اس سے پہلے تو زندہ دلی چاہیے

اپنی خوشبو ہواؤں سے چمن کی طرح
قریہ قریہ ہمیں بانٹنی چاہیے

چاہے پلکوں پہ روشن ہو خاکِ وطن
دردِ دل میں مگر عالمی چاہیے

ہم مظفرؔ حصاروں کے قائل نہیں
ذہنِ شاعر کو آوارگی چاہیے



اُس سے مِلنا خوب رہا تھا
سورج حوض میں ڈُوب رہا تھا

سارے زخم دِیے ہیں اُس نے
میں جس کا محبُوب رہا تھا

غیروں کی تحویل میں رہ کر
اپنے سے منسُوب رہا تھا

اُس کی دانشوری کی خاطر
ذہن مرا مجذوب رہا تھا

آنکھوں کے اندر کا موسم
ہر رُت میں مرطُوب رہا تھا

میری دوستیوں کے کارن
دُشمن بھی مغلُوب رہا تھا

باہر سے زندہ تھا لیکن
اندر سے مصلُوب رہا تھا

قُربِ شاہی میں بھی مظفر
مُعترضو، معتُوب رہا تھا



دار کی بات بھی دلدار سے کی جاتی ہے
اب عداوت بھی بڑے پیار سے کی جاتی ہے

لفظ بھی کینۂ مفہوم چھپا لیتے ہیں
نفی ہر بات کی اقرار سے کی جاتی ہے

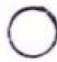
تازگی کے لیے ملتے ہیں، لہو چہروں پر
روشنی سایۂ دیوار سے کی جاتی ہے

میں سمجھ جاتا ہوں رُت آ گئی زنجیروں کی
جب تواضع مری، جھنکار سے کی جاتی ہے

قدر، اِنساں کی، ذہانت سے نہیں کی جاتی
سر پہ رکھی ہوئی دستار سے کی جاتی ہے

خوب معیار ہیں اپنے کہ پرکھ ہر شے کی
خُوبیوں سے نہیں مِقدار سے کی جاتی ہے

خاتمہ کیسے گُناہوں کا مظفرؔ ہوگا
جو رعایت ہے گنہ گار سے کی جاتی ہے



نہ جانے دل کو غم کیسے لگا ہے
یہ ظالم شوق بن چاہے لگا ہے

میں اپنے آگے آگے چل رہا ہوں
کہ ہر فردا مِرے پیچھے لگا ہے

اُجالے چُنتی پھرتی ہیں نگاہیں
اندھیرا عُمر کا بڑھنے لگا ہے

حدوں سے زندگی باہر نہ جانا
سمندر بھی کناروں سے لگا ہے

بتائے گا وہی تو رُخ ہوا کا
جو پتھر جسم پر اُڑ کے لگا ہے

مظفرؔ اپنی گمراہی سے بچنا
زمانہ راستہ دینے لگا ہے



ساری دنیا پہ آج
چند لوگوں کا راج

موت کی خواہشیں
زندگی کا علاج

آگ کے شہر میں
آندھیوں کا رواج

خوشبوئیں بھی کریں
پھول سے احتجاج

خود ہی مظلوم ہم
خود ہی ظالم سماج

ہر تلاطم میں ہے
ناؤ کا اندراج

مانگیں تاریکیاں
سورجوں سے خراج

آہٹیں بد دماغ
راستے خوش مزاج

ہم مظفرؔ رکھیں
اپنے دشمن کی لاج



کمزور تو ضرور تھا کم حوصلہ نہ تھا
گِر کر بھی ایسے اٹھ گیا جیسے گرا نہ تھا

جتنی ہر اجنبی سے رہیں آشنائیاں
اتنا تو اپنے آپ کو بھی جانتا نہ تھا

میرا تماشہ دیکھنے سب جمع ہو گئے
پہلے تو شہر میں کبھی میلہ لگا نہ تھا

آوازِ بازگشت بھی میرے خلاف ہے
وہ سُن رہا ہوں جو کبھی میں نے کہا نہ تھا

کچھ خوشبوؤں کی گرد بھی ہے میرے جسم پر
اُس سمت بھی گیا جو مرا راستہ نہ تھا

اوروں کو دوش دینا پرانا رواج ہے
ہم آپ ہی بُرے تھے زمانہ بُرا نہ تھا

رکھتا تھا ایک ہاتھ پہ سر، ایک میں قلم
کیا تھا بھلا، مظفرؔ اگر سر پھرا نہ تھا

○

مجھ سا محبت زادہ   صرف ترا دلدادہ

تیرا عکس بھی رنگیں   میرے رنگ بھی سادہ

تیرا نام، تصور   میرا نام ارادہ

تیرے قریب ہوں لیکن   پھر بھی ہوں دور اُفتادہ

میری سانسیں تھوڑی   دنیا بہت زیادہ

قبر بھی ایک پڑاؤ   منزل بھی اک جادہ

اُتنے تنگ نہیں رستے   جتنا ذہن کشادہ

کاٹے سانس مظفرؔ

بنتا جاؤں بُرادہ



سخنور وارثی قلندر وارثی
کرے سلطانیاں گداگر وارثی
یہ دنیا ناؤ ہے سمندر وارثی
نہ تم ہی آئنہ نہ پتھر وارثی
فلک بردوش ہے زمیں پر وارثی
چلے مقتل میں بھی اکڑ کر وارثی
اندھیرا بڑھ چلا چلو گھر وارثی

بھلا سا نام ہے
مظفرؔ وارثی



کسی دیوار پر اپنی ہی کچھ پرچھائیاں رکھ لو
چراغِ ہجر ہوں مجھ کو بھی اپنے درمیاں رکھ لو

محبت بے رخی کو اپنے رستے پر لگا لے گی
تمہیں جتنا قریب آنا ہے اُتنی دوریاں رکھ لو

میں اپنی وحشتِ دل کی ضمانت دینے آیا ہوں
گریباں ہے نہ دامن ہے بدن کی دھجیاں رکھ لو

اندھیرا ہو جہاں اُس گھر کے لوگوں پر گرا دینا
دعائیں چاہئیں تو آستیں میں بجلیاں رکھ لو

زمانے بھر کی رونق اپنے دروازے پہ لے آؤں
تم اپنے پاس اگر کچھ دن مری تنہائیاں رکھ لو

اگر سنجیدہ لوگوں پر اثر انداز ہونا ہے
تو اپنے عامیانہ پن میں خوش اسلوبیاں رکھ لو

سفر پر جانیوالو راہ میں مقتل بھی آئیں گے
تو عزت اِس میں ہے کاندھوں پہ خود ہی سُولیاں رکھ لو

افاقہ اِس سے اندر کی گھٹن میں تو نہیں ہوگا
مظفرؔ گھر میں کتنے ہی دریچے کھڑکیاں رکھ لو



محبتوں کی وہ روداد اب تو یاد نہیں
کہیں کہیں سے ہے کچھ یاد، سب تو یاد نہیں

کچھ اُس کو بھول گیا اور کچھ نہیں بھولا
صدا ہے کان میں رخسار و لب تو یاد نہیں

ہیں آپ اپنے ہی ہاتھوں سے گر کے ٹوٹا تھا
سبب اگر کوئی پوچھے سبب تو یاد نہیں

بڑھا تھا اُس کی طرف میرا ہاتھ یا آنکھیں
طلب ہے ذہن میں حسنِ طلب تو یاد نہیں

جہاں سے وحشتِ دل کو مری ملا تھا فروغ
مجھے وہ حلقۂ اہلِ ادب تو یاد نہیں

اک آدمی ہوں یہی بس مرا حوالہ ہے
پرکھ کے دیکھ لو، نام و نسب تو یاد نہیں

نہ زندگی کا سلیقہ نہ بندگی کا شعور
کچھ اور ہو گا ہمیں یاد، رب تو یاد نہیں

مظفرؔ اُس کو کیا ہو نہ یاد جب ہم نے
کوئی بھی ایسی جدائی کی شب تو یاد نہیں



حادثے خونِ تمنّا سے رقم کرتے چلو
جتنے جلتے رہیں، محفوظ وہ غم کرتے چلو

جیسے جیسے ہو اُجاگر سحرِ نو کی اُمید
شمع کی لَو اُسی رفتار سے کم کرتے چلو

اپنے دِل پر ہی نہ کھاتے رہو حالات کے زخم
زخمیؤ دیدۂ حالات بھی نم کرتے چلو

روشنی پڑتی رہے جس سے نئی راہوں پر
اس قدر رہبرئ نقشِ قدم کرتے چلو

کوئے قاتل میں مظفر رہے گردن اُونچی
اور سر، عشق کی دہلیز پہ خم کرتے چلو



چپکے سے میرے زخم پہ مرہم لگا دیا
ظالم نے ایک اور مجھے غم لگا دیا

پہلے تو قہقہوں سے نوازا گیا مجھے
پھر میرے ساتھ دیدۂ پرنم لگا دیا

آندھی، مرا مکان گرانے بھی آئے گی
میں نے بھی چھت پہ امن کا پرچم لگا دیا

تنہائی بھی نہ رکھ سکی جب مجھ کو راز میں
تو مجھ پہ داغِ شہرۂ عالم لگا دیا

آیا تھا میں حیات کا احساں اتارنے
دنیا نے شوقِ عظمتِ آدم لگا دیا

شعلہ تھا میرا جسم، اندھیرے مرا لباس
ہر رات آشنا لگی، محرم لگا "دیا"

کتنی فراخ دل تھیں مظفرؔ محبتیں
سوکھے لبوں سے ساغرِ شبنم لگا دیا

○

موت اگر ہم پہ طاری نہیں ہو رہی
زندگی کیوں ہماری نہیں ہو رہی

حبسِ بے جا میں رکھا ہے قانون کو
اس لیے فردِ جاری نہیں ہو رہی

سائے بھی اُس نے دیواریں چن دیئے
روشنی سے بھی یاری نہیں ہو رہی

لوگ اَن دیکھے زخموں سے کیوں چُور ہیں
جب کوئی سنگ باری نہیں ہو رہی

بوئی جاتی ہیں ہر کھیت میں نفرتیں
پیار کی آبیاری نہیں ہو رہی

ذہن کا بوجھ دراصل بڑھنے لگا
سر کی گٹھڑی تو بھاری نہیں ہو رہی

اے مرے دیس کے دردمندو، کہو
کیا دُکھی، قوم ساری نہیں ہو رہی؟

کچھ تو حالات بھی سچ نہیں بولتے
کچھ حقیقت نگاری نہیں ہو رہی

سانس بھی کیا درآمد نہیں ہو رہے
کیا مظفرؔ یہ خواری نہیں ہو رہی



کدھر ہے آئنہ، چہرہ کہاں ہے
حقیقت بھی کسی کی داستاں ہے

مری آواز بھی مجھ تک نہ آئے
وہ ہنگامہ پسِ دیوارِ جاں ہے

نکل آؤں گا دستک دے کے دیکھو
یہ ویرانی بھی میرا ہی مکاں ہے

قدم کی خاک کو کمتر نہ سمجھو
زمیں، گہرائیوں کا آسماں ہے

چمن سے خوشبوئیں لے کر چلا تھا
جو گھر پہنچا ، ہوا بولی ، دھواں ہے

اَٹی ہے دھول مٹّی میں رعایا
تو کیا آندھی یہاں کی حکمراں ہے

چلو سو جائیں ، چل کر سولیوں پر
اگر کچھ ہے تو مقتل میں اماں ہے

محبّت سے مظفرؔ پیش آؤ
کہ یہ ہر ایک نقطے کی زباں ہے



زندگی تجھ سے جدا ہو کے کدھر جاؤں گا
تُو اگر روٹھ گئی مجھ سے تو مر جاؤں گا

آندھیو مجھ کو بجھانے کی تگ و دو نہ کرو
روشنی جتنی مجھے کرنی ہے کر جاؤں گا

کسی تنکے نے اگر مجھ کو سہارا نہ دیا
ڈوبتے ڈوبتے بھی پار اتر جاؤں گا

خون دے کر بھی نکھاروں گا فسردہ چہرے
رنگ بھرنے کے لیے آیا ہوں بھر جاؤں گا

بعد میں کوئی سمیٹے نہ سمیٹے مجھ کو
میرا منصب تو بکھرنا ہے بکھر جاؤں گا

پیار کرنا مری عادت مری مجبوری ہے
دشمنی یہ نہ سمجھ لے کہ میں ڈر جاؤں گا

کوئے جاناں ہو کہ مقتل کہیں لے جاؤ مجھے
مسکراتا ہوا جاؤں گا جدھر جاؤں گا

راستہ کوئی مظفرؔ نہیں دیتا تو نہ دے
اپنے سینے پہ قدم رکھ کے گزر جاؤں گا



آنکھوں میں آنسوؤں کی اک شمع جل رہی ہے
پرچھائیاں کھڑی ہیں، دیوار چل رہی ہے

سینوں میں جھانکنا بھی بینائی کو سکھا دو
آئینہ ساز دنیا، چہرے بدل رہی ہے

منظر تو ہیں سہانے، کوئی مگر نہ جانے
سورج نکل رہا ہے یا شام ڈھل رہی ہے

بادِ صبا سے پوچھو، یہ کس کو پھونک ڈالا
جلتے ہوئے مکاں سے خوشبو نکل رہی ہے

کیا جانے زندگی پر، کیسا جنوں ہے طاری
رنگینیاں بھی پہنے، کالک بھی مل رہی ہے

طوفاں تو مہرباں تھا، نیّت بگاڑ نکلی
ملاح ڈولتا ہے کشتی سنبھل رہی ہے

کرتا ہے آدمی بھی، باتیں درندگی کی
تہذیب کیا مظفرؔ، جنگل میں پل رہی ہے



عجیب قتل گہہِ جستجو میں رہتا ہوں
بغیر گھاؤ کے، لت پت لہو میں رہتا ہوں

ابھی میں جس کا تصور بھی کر نہیں سکتا
اسی طلب میں اسی آرزو میں رہتا ہوں

اٹا ہوا ہوں میں گردِ غبار میں سارا
اگرچہ بلدیۂ رنگ و بو میں رہتا ہوں

فصیلِ ذات کے پیچھے قیامتیں ہیں بپا
اکیلا ہوتے ہوئے، ہاؤ ہو میں رہتا ہوں

سمندروں میں بھی رہ کر کچھ ایسے لگتا ہے
کہ جس طرح میں کسی آبجو میں رہتا ہوں

سماعتوں پہ کبھی دستکیں بھی میں دوں گا
ابھی تو زاویۂ گفتگو میں رہتا ہوں

یہ کون رند مجھے گھونٹ گھونٹ پیتا ہے
میں کس کے جام میں کس کے سبو میں رہتا ہوں

بس ایک مجھ میں مظفؔر بڑی خرابی ہے
نگاہِ حسن، دلِ خوبرو میں رہتا ہوں

○

شاعری میرا ہنر ہی نہیں کردار بھی ہے
میرے ہاتھوں میں قلم ہی نہیں تلوار بھی ہے

کریں اندر کے اجالے بھی تعاقب میرا
سایہ دیوار پہ بھی ہے پسِ دیوار بھی ہے

کربلاؤں کا مسافر تو مجھے کہتے ہو
میرے ہمراہ کوئی چلنے کو تیار بھی ہے

سر جھکانا نہیں آتا تو بڑھو دار کی سمت
اور بکنے کا ارادہ ہے تو بازار بھی ہے

جلتا رہتا ہوں چراغوں کی طرح جن کے لیے
اُن سے پوچھو تو انھیں روشنی درکار بھی ہے

جتنے بہروپ ہیں آنکھیں بھی نہ اتنی ہونگی
خود ہی اسٹیج ہے دنیا خود اداکار بھی ہے

اُس کی آواز بھی دامانِ سماعت کھینچے
پاؤں سے لپٹی ہوئی وقت کی رفتار بھی ہے

یار تو سب ہی مظفرؔ مرے دشمن نکلے
دشمنوں میں مرے کیا کوئی مرا یار بھی ہے

○

آدمی بے عمل ہو گیا — یا زمانہ ہی شل ہو گیا
فاصلے کس قدر بڑھ گئے — آج کا نام کل ہو گیا
کھو دیا جستجو نے مجھے — رنگ پانی میں حل ہو گیا
زندگی اچھی لگنے لگی — یا شعورِ اجل ہو گیا
میرے آنسو بھی کام آ گئے — ایک چہرہ کنول ہو گیا
آنکھ ملتے ہی دل مل گئے — پھول کھلتے ہی پھل ہو گیا
خود سے ہٹ کر جو سوچا ئے — مرثیہ بھی غزل ہو گیا
آئے، کس کے مظفرؔ قدم
جھونپڑا بھی محل ہو گیا



دل مرا اُس کی نظر سے ٹُوٹا
آئنہ، آئنہ گر سے ٹُوٹا

آنکھ سے میری گرا ہے آنسو
یا کوئی پھُول شجر سے ٹُوٹا

میری سانسوں نے بکھیرا مجھ کو
سنگ اپنے ہی شرر سے ٹوٹا

سِلسلہ کوئی نہ توڑا مَیں نے
جب بھی ٹوٹا ہے اُدھر سے ٹُوٹا

کون مظلوم دُعا مانگتا ہے
رشتۂ حرف، اثر سے ٹوٹا

کس کے انصاف کی تلوار چلی
جسم کا رابطہ سر سے ٹوٹا

زندگی بھر کی جُدائی کا غرور
پیار کی ایک نظر سے ٹوٹا

کس کی آواز مظفرؔ آئی
یہ ستارہ سا کدھر سے ٹوٹا



زبانِ حسن میں سب سے کلام کرتا ہے
یہ جائداد وہ ہر اِک کے نام کرتا ہے

جسے زمانے کی تذلیل کا ہنر آئے
زمانہ اُس کا بڑا احترام کرتا ہے

سفر کا شوق ہے لیکن ہمارا عزمِ سفر
قدم اُٹھاتے ہُوئے بھی قیام کرتا ہے

جو اپنی رات بھی بیداریوں پہ خرچ کرے
اُسی کو صبح کا تارہ سلام کرتا ہے

ترقّیوں کا ہے شوقین آدمی، لیکن
تباہیوں کا بہت اہتمام کرتا ہے

بڑے وقار سے سچائیوں کے عہدوں پر
دروغِ مصلحت آمیز کام کرتا ہے

معاشرہ ہے مظفرؔ قصوروار اگر
وُہ کون ہے جو اسے بے لگام کرتا ہے



زندگی خواب کی طرح دیکھی
ناؤ گرداب کی طرح دیکھی

میری عریانیوں کو ڈھانپ لیا
گرد، کم خواب کی طرح دیکھی

عمر بھر چھیڑتی رہی ہم کو
سانس مضراب کی طرح دیکھی

راستے کی تھکن بھی کاندھے پر
مال و اسباب کی طرح دیکھی

عشق نے اُس کے راکھ کر ڈالا
بَرف، تیزاب کی طرح دیکھی

غرق ہو ہو گئے پسینے میں
دُھوپ سیلاب کی طرح دیکھی

اپنے اندر کی تیرگی ہم نے
پرِ سُرخاب کی طرح دیکھی

امن کے تاجروں نے یہ دُنیا
ایک قصّاب کی طرح دیکھی

ہم نے زندہ دِلی مظفؔر میں
اہلِ پنجاب کی طرح دیکھی



سفر، ہر ایک کے حصّے کا مجھ کو کرنا تھا
وہاں بھی چلتا رہا ہوں جہاں ٹھہرنا تھا

اِسی لیے تو کوئی راہ مجھ سے خوش نہ ہوئی
کہ راہ سے نہیں، جاں سے مجھے گزرنا تھا

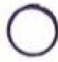
تڑپتا چھوڑ گیا تشنگی کو ساحل پر
کہ میرے ظرف کو دریا کے پار اُترنا تھا

سُنی تھی پہلی صدا میں نے اپنے رونے کی
دراصل میری ولادت ہی میرا مرنا تھا

جبھی تو پیار سے دُنیا نے ہاتھ تھامے تھے
کہ ہاتھ تھام کے، سینے پہ پاؤں دھرنا تھا

حیات نغمہ نہ بنتی تو آہ بن جاتی
ترے لبوں پہ بکھرتا اگر بکھرنا تھا

یہ کیا کہ گردِ مظفرؔ جمی رہی مجھ پر
مجھے تو وقت کے خاکے میں رنگ بھرنا تھا



بدل سکا تو ہواؤں کا رُخ بدل دوں گا
نہیں تو خاکِ دل و جاں اڑا کے چل دوں گا

تو ایک بار مری جھونپڑی میں آ تو سہی
میں پتھروں کا نہیں پیار کا محل دوں گا

کیا گیا نہ مرے سچ کا احترام اگر
رگوں میں جتنا بھی یہ زہر ہے اگل دوں گا

دیا تو جائے مجھے زندگی کا حق پہلے
تو پھر مسائلِ دنیا کا میں بھی حل دوں گا

مظفرؔ اپنے وطن کی کسی سحر کے لئے
اگر شفق نہ ملی اپنا خون مل دوں گا



ہاں تم کو اجازت ہے آنکھیں مری نم رکھنا
دشوار تمہیں ہوگا پانی پہ قدم رکھنا

ناتا ہی تو ٹوٹا ہے سانسیں تو نہیں ٹوٹیں
تصدیقِ تعلق ہے امیدِ کرم رکھنا

ٹکرانا ہی گر ٹھہرا ٹکرائیں گے ہم خود سے
توہینِ محبت ہے پتھر کے صنم رکھنا

ایسے کسی جذبے کی تکمیل نہیں ہوتی
نیت میں دغا رکھنا ہونٹوں پہ قسم رکھنا

تقلیدِ چراغوں کی، اندازِ بغاوت کے
جلنا بھی ہواؤں میں، اور لَو بھی نہ کم رکھنا

گویائی کا ہیرہ بھی دیوار میں جڑنا ہے
تنہائی سے لڑنا ہے آواز میں دم رکھنا

سچ حوصلہ دے جائے یا دار پہ لے جائے
منصب ہے مظفرؔ کا ناموسِ قلم رکھنا



خفا اسی لیے مجھ سے زمانہ ہوتا ہے
کہ میرا سچ بھی بڑا وحشیانہ ہوتا ہے

اُسے گلے سے لگاتی ہیں کتنی دیواریں
کھُلی فضا کی طرف جو روانہ ہوتا ہے

غبارِ راہ بھی کچھ لوگ اوڑھ لیتے ہیں
یہ جسم ڈھانپنے کا اِک بہانہ ہوتا ہے

جگہ کی قید نہیں کوئی، بندگی کے لیے
جبیں کے ساتھ بھی اِک آستانہ ہوتا ہے

ہر اِک صدا پہ میں اُس کا جواب سُنتا ہُوں
اگرچہ رُدئے سخن غائبانہ ہوتا ہے

اَدب سے بات کرو ہم فقیر لوگوں سے
مزاجِ خاک نشیں خسروانہ ہوتا ہے

مظفرؔ اب کہاں بِلے لوٹ چاہنے والے
سلوکِ یار بھی اب تاجرانہ ہوتا ہے



نسلِ یقیں ہیں اور بنیاد اُٹھاتے ہیں اندازوں پر
دستک ہم دیتے ہیں گویا، قفل لگے دروازوں پر

زندہ رہنے کے آداب بھی شاید ہم تم بھول گئے
ماتم باراتوں میں ہوتا ہے اور رقص جنازوں پر

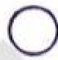
آج ہمارے انجاموں پر کتنی اُداسی چھائی ہے
ہم نے کیسا کیسا شور مچایا تھا آغازوں پر

سادگیوں کے لہجے میں سُنتا ہے باتیں کون یہاں
چیخوں کا اظہار بھی کرنا پڑتا ہے اب سازوں پر

اتنی بھیڑ میں بھی کیونکر تنہائی کا احساس نہ ہو
کچھ سناٹوں نے قبضہ کر رکھا ہے آوازوں پر

پستیِ فکر و عمل کا ہم نے نام ترقّی رکھا ہے
زیرِ زمیں سے جایا کرتے ہیں اونچی پروازوں پر

رسم مظفرؔ چل نکلی اعلانیہ سازش کرنے کی
دیدۂ بینا کا پردہ ڈالا جاتا ہے رازوں پر



متاعِ دردِ محبّت کو رائیگاں نہ کہو
تم اپنی بات کرو میری داستاں نہ کہو

مہک اُٹھا ہُوں زمانے کی آگ میں جل کر
مِری حیات کو خُوشبو کہو دُھواں نہ کہو

دھڑک رہا ہے مِرا دل ہر ایک لمحے میں
ہَوا کی لہر کہو، پاؤں کا نشاں نہ کہو

عجب نہیں کہ تُمھارا وُہ دوست بن جائے
حریفِ جاں کو بھی اپنے حریفِ جاں نہ کہو

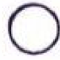
جو چاہتے ہو کہ پیروں تلے زمین رہے
تو اپنے قد کی بلندی کو آسماں نہ کہو

کہاں سے دوگے جو ساحل کسی نے مانگ لیا
بھنور کو ناؤ، ہواؤں کو بادباں نہ کہو

کرو نہ اتنی بھی دلجوئیاں کہ دل مر جائے
چراغ بھی جو نہیں اُس کو کہکشاں نہ کہو

مرے قدم مری حدِّ نظر سے آگے ہیں
میں کارواں ہوں مجھے گردِ کارواں نہ کہو

دُکھاؤ دِل نہ مظفرؔ کسی بھی موسم کا
زبانِ خشک سے پت جھڑ کو بھی خزاں نہ کہو



مَرے گا جب وقت ہست ہوگا نہ بود ہوگا
نہ ہوگا کچھ بھی تو جانے کیسا جمود ہوگا

وجُود سے جب نکل رہی ہیں عدم کی راہیں
عدم میں بھی پھر کوئی جہانِ وجُود ہوگا

میں ایک نقطے سے بٹ گیا کتنے دائروں میں
مرا سمٹنا بھی کس قدر بے حدُود ہوگا

عبوُر کر لوں گا جب میں ہر زاویے سے خُود کو
جبھی کچھ اندازۂ مقامِ شہود ہوگا

رہوں گا زندہ میں اپنی تخلیق میں منظفرؔ
مِرے ہر اک لفظ میں پیامِ نمود ہوگا



جھوم لے ہنس بول لے، پیاری اگر ہے زندگی
سانس کے بس ایک جھونکے کا سفر ہے زندگی

دیر ہی بنتے بگڑتے کچھ اسے لگتی نہیں
پھول کی دیوار پر شبنم کا گھر ہے زندگی

زندگی میں جو بھی کرنا چاہتا ہے، کر گزر
کیا خبر برسوں کی ہے یا لمحہ بھر ہے زندگی

اجنبی حالات سے بھی ہنس کے ملنا چاہیے
ہر قدم پر مڑنے والی رہگزر ہے زندگی

بھیجتا رہتا ہوں جانے اپنی سانسیں کس کے نام
یارِ نامعلوم کی اک نامہ بر ہے زندگی

دشت میں نکلو تو کانٹا ہے تھکن ہے گرد ہے
ناؤ میں بیٹھو تو لگتا ہے بھنور ہے زندگی

تا ابد اس سے نہ ٹوٹے گا مظفرؔ رابطہ
موت سے آگے عدم کے نام پر ہے زندگی



کاندھوں پہ ہم اپنے کنتے معیار اُٹھائے
جینے کو چلے میتِ کردار اُٹھائے

پستی کی چھبتیں ڈال رہا ہے وہ سروں پر
بہتے ہوئے پانی پہ جو دیوار اُٹھائے

چہروں کی نقابوں کا ہمیں فکر نہیں ہے
ذہنوں سے کوئی پردۂ اسرار اُٹھائے

اعزاز ہوا کرتا ہے ماتھے کا لہو بھی
سر بھی تو کوئی صاحبِ دستار اُٹھائے

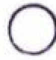
کیوں اُس سے بغاوت پہ نہ آمادہ ہو خوشبو
جو کھلتے ہُوئے پھوُل پہ تلوار اُٹھائے

تخلیق کے لہجے میں کرے بات سخنور
آواز کسی طور تو فنکار اُٹھائے

معلوم ہے ہم کو جو سزا ہم کو ملے گی
نکلے ہیں گھروں سے رَسن و دار اُٹھائے

سوتے میں بھی احساسِ اسیری نہیں جاتا
بستر سے بھی زنجیر کی جھنکار اُٹھائے

نا اہل لیا کرتے ہیں سازش کا سہارا
ہاتھ اُس پہ مظفرؔ سرِ دربار اُٹھائے



اُڑان اپنی کبھی مَیں نے آزمائی نہیں
وہاں چلا ہوں جہاں تک مری رسائی نہیں

جسے چھُوا بھی نہیں اُس کا لمس ہاتھ میں ہے
میں چاہتا ہوں اُسے جس سے آشنائی نہیں

مجھے نہ میری تمنّاؤں کے سپرد کرو
کہ اپنی لاش تو میں نے کبھی اُٹھائی نہیں

فقیر ایسا، طلب ہی نہیں جسے کوئی
اسیر ایسا، جسے خواہشِ رہائی نہیں

جو روشنی سے محبت، وہی اندھیروں سے
سحر بھی اپنی ہے اور رات بھی پرائی نہیں

ہر ایک سانس پہ وہ ہے مرا شریکِ سفر
نظر نہ آنے کا مفہوم تو جُدائی نہیں

اگر ہو عزم مظفرؔ بھلائی کرنے کا
تو پھر بُروں میں بھی رہنا کوئی بُرائی نہیں



قریب ہوتے ہوئے فاصلہ زیادہ تھا
بچھڑ گیا وہی جو آشنا زیادہ تھا

محبتوں سے بھی لیتا تھا بندگی کا خراج
وہ شخص آدمی کم تھا خدا زیادہ تھا

ضرور بے ثمروں کی یہ کوئی سازش تھی
وہ پیڑ سوکھ گیا جو ہرا زیادہ تھا

زمیں کے ساتھ یہ کیسے مرے مراسم تھے
کہ راہ طے ہوئی کم، اور چلا زیادہ تھا

دُکھوں کی دوڑ میں آگے نکل گیا سب سے
میں کیا کروں کہ مِرا حوصلہ زیادہ تھا

اِسی لیے تو بدلنے پڑے اُسے چہرے
کہ آئنہ بھی اُسے دیکھتا زیادہ تھا

مِرے خلوص میں از خُود کمی نہیں آئی
غرور اُس میں مظفرؔ ذرا زیادہ تھا



تم ہی فانی نہیں تم نے کبھی سوچا لوگو
ایک دن وقت کو بھی مرنا پڑے گا لوگو

موسموں کے بھی تو اعصاب پڑیں گے ڈھیلے
روز و شب پر بھی تو آئے گا بڑھاپا لوگو

رُوئی کی طرح فضاؤں میں اُڑیں گے کہسار
خاک ہو جائیں گے بہتے ہُوئے دریا لوگو

تارے جھڑ جائیں گے گِر جائے گا بُجھ کر مہتاب
بند ہو جائے گا سُورج کا نکلنا لوگو

تہہ کیے جائیں گے افلاک صفوں کی مانند
اور ہو جائے گا شق سینہ زمیں کا لوگو

سانس لینے کی ہوا کو نہ اجازت ہوگی
نقطۂ حال پہ رُک جائے گا فردا لوگو

جس کی دہشت ہے زمانوں پہ ازل سے طاری
وُہ قیامت بھی تو ہوگی کبھی برپا لوگو

وہ بھی وقت آئے گا جب موت کو موت آئیگی
اُس کی میّت کو نہ دے گا کوئی کاندھا لوگو



جس کے شگفتہ پن سے ہم نے پیار کیا تھا
اُس نے ہی ہم کو بے برگ و بار کیا تھا

خوُن کے آنسوُ روتی ہیں وُہ صدیاں ہم پر
جن صدیوں کو لمحوں میں مسمار کیا تھا

بھوُل گئے ہم وُہ رستے بھی جن رستوں کو
اپنے سینے پر چل کر ہموار کیا تھا

خوف زدہ ہو کر تو چیخ نہیں ماری تھی
اندر کے سناٹوں کا اظہار کیا تھا

اب تم ہم سے اپنا حق کیوں مانگ رہے ہو
تم نے ہی تو ہم کو دُنیا دار کیا تھا

دُوسرے ساحل پر آ کر ہم سوچ رہے ہیں
ہم نے آخر کیوں یہ دریا پار کیا تھا

چاٹ رہے ہیں آج بھی اپنے زخم مظفرؔ
اپنے اُوپر ہم نے کیسا وار کیا تھا



سوال بھی میں کروں اور جواب بھی میں دُوں
تری خطاؤں کا گویا حساب بھی میں دُوں

زمانہ چاہتا ہے میرے پاس کُچھ نہ رہے
کروں میں آنکھیں بھی تقسیم خواب بھی میں دُوں

اسی لیے تو چمن میں وجُود ہے میرا
کہ خار بھی میں چُنوں اَور گلاب بھی میں دُوں

سکھاؤں سنگدلوں کو محبّتیں کرنی
پھر اُن کو تربیتِ انقلاب بھی میں دُوں

بھروں قدیم زمانوں میں اپنے عہد کے ساتھ
اور آسماں کو نیا آفتاب بھی میں دُوں

اَساتذہ بھی مظفرؔ ہیں میرے حلقہ بگوش
پڑھوں بھی مدرسے میں اَور نصاب بھی میں دُوں



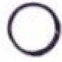
اجنبی بنتے ہیں اپنے سامنے آ کر بھی ہم
اپنے قاتل بھی ہمی ہیں اپنے نوحہ گر بھی ہم

آندھیوں سے کر رہے ہیں دوستی کا عہد بھی
اور اوڑھے پھر رہے ہیں کاغذی چادر بھی ہم

بیچ کر اپنا ضمیر و ذہن کھولی ہے دکاں
دھوپ کے تاجر بھی ہم، شبنم کے سوداگر بھی ہم

چھوٹی سی دنیا ہیں ہم دنیا بڑا سا آدمی
آئنہ ہم عکس ہم آنکھیں بھی ہم منظر بھی ہم

برسرِ پیکار اپنی ذات سے ہم کیوں نہیں
جب مظفرؔ ذات کے اندر بھی ہم باہر بھی ہم



زندگی ایسے خرابے میں پھلی پھولی ہے
دِل جہاں زخم ہے احساس جہاں سُولی ہے

جس نے ہر گام پہ چھوڑے ہوں محبت کے نشاں
اُس مسافر کو کہیں راہگزر بھولی ہے

مَیں نے چھیڑا جو کبھی ذکر چمن میں اُس کا
میرے الفاظ سے پھولوں نے بھی خوشبو لی ہے

پھر کوئی کھِلتا ہُوا پھول کِسی نے توڑا
ہِل گیا ہے مِرا دل شاخ اگر جھولی ہے

دوستی تلخیٔ دُنیا سے رہی ہے اِتنی
حادثہ کوئی ہو، اپنے لِیے معمُولی ہے

پھُول بھی اُس نے مظفرؔ مجھے ایسے مارا
جیسے کانٹے سے کسی نے رگِ جاں چھولی ہے



مرے دیار کے کچھ لوگ ہیں نرالے سے
نگاہ سبز زباں سُرخ ذہن کالے سے

سفید ہو گیا شاید ہر آدمی کا لہو
اُجالا برسرِ پیکار ہے اُجالے سے

کھنچی ہوئی ہیں مرے اِرد گِرد دیواریں
زمانہ کیسے ملے مجھ میں رہنے والے سے

تُو اپنے آپ کو مجھ میں تلاش کر دینا
میں جانتا ہُوں تجھے ذات کے حوالے سے

جو نبھ رہی ہیں مظفرؔ پرانی دوستیاں
تو بس کتاب سے اخبار سے رسالے سے



اگر سانس لینے میں کچھ ہم کو محنت بھی درکار ہوتی
تو اے مالکِ زندگی، زندگی کتنی دشوار ہوتی

ملی کب فراغت ہمیں اپنے اندر کی تاریکیوں سے
جو ہم روشنی چاہتے، پتھروں سے نمودار ہوتی

ہمارا مذاقِ سماعت تو ہر روز فاقے نہ مرتا
نہ ہوتی جو نغموں کی آواز، آہوں کی جھنکار ہوتی

اکیلا اکیلا ہمیں کر گئی صاف گوئی ہماری
اگر مصلحت کوش ہوتے تو دُنیا طرف دار ہوتی

اگر ہم حصاروں میں رہنے کے قائل نہ ہوتے مظفرؔ
تو لوہے کا دروازہ ہوتا نہ شیشے کی دیوار ہوتی



قلندر ہو گیا
میں خود میں ڈوب کر
سمندر ہو گیا

بڑی گہرائی میں
رہا تنہائی میں
تو شکر ہو گیا

الٰہی خیر کر
لہو میں تیر کر
معطّر ہو گیا

بہت چھپ کر رہا
جو پسِ منظر رہا
وہ منظر ہو گیا

ملی اُس سے نظر
تو اُس کو دیکھ کر
میں پتھر ہو گیا

چلی دونوں کی چال
حسابِ دوستاں
برابر ہو گیا

یہ ہم نے کیا کیا
کہ ہر بالشتیہ
قد آور ہو گیا

گیا وہ ہات سے
حدودِ ذات سے
جو باہر ہو گیا

لہک کر بات کی
مظفرؔ وارثی
سخنور ہو گیا

مطلعے اور اشعار

اے مرے وحدت مآب اے مرے ربِّ غفور
دل سے تو جتنا قریب عقل سے اتنا ہی دور



ہر لمحہ ترا اے مرے سلطانِ رسولاں
آیات الٰہی کے چراغوں میں فروزاں



اُن کے نقشِ قدم پہ چلتا ہوں
آسمانِ حرم پہ چلتا ہوں
درحقیقت میں اس وجود کے ساتھ
پلصراطِ عدم پہ چلتا ہوں

بُرا ہو لہجہ تو کیوں بات بھی بُری نہ لگے
میں کوئی سایہ نہیں ہوں کہ چوٹ ہی نہ لگے

○

مرا ہی فکر مجھے پاش پاش کرتا ہے
خیال، آنکھ کا حصہ تلاش کرتا ہے

○

رو رہا تھا میں کسی جلتی ہوئی خواہش کے ساتھ
خیر مقدم کرنے آئی دھوپ بھی بارش کے ساتھ

○

محبت اُن کے لیے ہم فقیر رکھتے ہیں
جو اپنے ترکشِ احساں میں تیر رکھتے ہیں

○

اپنے قد و قامت سے بھی کچھ لوگ بڑے ہیں
بالشتیے کس شان سے منبر پہ کھڑے ہیں

○

کس جرمِ اجنبی کی سزا کاٹتا رہا
اپنی چھری سے اپنا گلا کاٹتا رہا

○

اب کے ہوائیں کیا چلیں حبس کچھ اور بڑھ گیا
پیار کی عمر گھٹ گئی ظلم کا دور بڑھ گیا

جاگتی آنکھوں بھی جب میں نے اُس کا خواب وصول کیا
اُس کے ہجر نے میری ساری نیندوں کو معزول کیا

○

میرے سر پہ بوجھ میری زندگی کا رکھ دیا
قتل کر کے جیب میں خط خودکشی کا رکھ دیا

○

صدائیں گونجتی ہیں شکل پس منظر میں رہتی ہے
اب اک دیوار بھی ہر کھُلنے والے در میں رہتی ہے

○

محبت کا تو پتھر مارنا بھی اچھا لگتا ہے
سہانی صورتوں سے ہارنا بھی اچھا لگتا ہے

○

ہر شخص کی برہنگیاں اپنے پاس ہیں
دنیا سمجھ رہی ہے کہ ہم بے لباس ہیں

○

آنکھ کو شوقِ عالم آرائی
اور مری سیرگاہ تنہائی

○

خون کی دھار پہ چلنے کا ہنر آتا ہے
ہم کو تلوار پہ چلنے کا ہنر آتا ہے

اے آئینہ گرو پسِ دیوار کون ہے
سب بے گناہ ہیں تو گنہگار کون ہے

○

غور سے رونقِ زندگی دیکھنا
صرف سایہ نہیں دھوپ بھی دیکھنا

○

سب سے یاری کا گُر سیکھ لو
دنیا داری کا گُر سیکھ لو

○

آنکھ کے اندر لپک گیا اک شعلہ سا بینائی کا
تاریکی میں دیکھ لیا چہرہ اپنی تنہائی کا

○

مرا سکوت اور اُس کی صدا بدل جاتی
تو سارے شہر کی آب و ہوا بدل جاتی

○

سنگدل مظلوم کا غم خوار ہو سکتا نہیں
کوئی سوکھا پیڑ سایہ دار ہو سکتا نہیں

○

کاندھوں تک اپنے صلیب آگئی
لگتا ہے منزل قریب آگئی

سُولی پہ تہمتوں کی ہیں ناحق ٹنگے ہُوئے
بے قتل بھی ہیں ہاتھ لہُو میں رنگے ہُوئے

○

ساری عُمر پڑھا ہے جس کو فقط اُسی مضمون کا ہے
یہ عہدِ بے ہُنری بھی، تحفہ اربابِ فنوُن کا ہے

○

احساں نہ تم جتایا کرو اپنے پیار کے
رکھتا نہیں میں جیب میں سکّے اُدھار کے

○

امن ہوگا تو محبت ہوگی
زندگی ورنہ قیامت ہوگی

○

تم سے بھی مُجھ کو پیار ہے دُنیا کا بھی جانی ہوں میں
دو ساحلوں کے درمیاں بہتا ہوُا پانی ہُوں میں

○

زہرِ حیات بن کے رگوں میں اُتر گیا
میرے وجُود میں وُہ مجھے دفن کر گیا

○

میں چاہتا ہُوں کہ آؤں کبھی نہ ہاتھ اپنے
کسی کو سونپ دیئے سب معاملات اپنے

میں اپنی حُسن پرستی کا خود شکار ہُوا
کسی سے آنکھ ملاتے ہی تار تار ہُوا

○

کیا کیا خیال ذہن کی دیوار سے اُڑے
تتلی سے رنگ جب ترے رُخسار سے اُڑے

○

وجود صرف خُدا کا ہے آدمی کا نہیں!
خُدا ہر ایک کا ہے آدمی کسی کا نہیں

○

سرمایہ قوم کا کہلائیں لیکن زندہ اپنے لیے ہیں
کچھ ایسے عظیم انسان بھی ہیں جو اندر سے بالشتیے ہیں

○

جاگتی آنکھوں ایک سُنہرا سپنا دیکھوں
ہر انسان کے سینے میں دِل اپنا دیکھوں

○

ملے گا مَر کے سکوں کی اگر ضرورت ہے
سکوں تو مَوت کا اِک اسمِ خُوبصورت ہے

○

کس سے پیار کیا پگلے، تو مٹّی کا وہ سونے کا
کچھ انجام بھی سوچا ہے اِس انہونی کے ہونے کا

زندگی کے ہر سفر پر ہم قرینے سے گئے
پھر بھی دُنیا کہہ رہی ہے تم تو جینے سے گئے

○

تنہائی میں اپنی پیار کا میلہ لگتا ہے
ایک ہی شخص ہمیں تو ساری دُنیا لگتا ہے

○

ہم اہلِ حرف، دشمن کو بھی اپنے پیار دیتے ہیں
سیاست داں تو قوموں کو اکثر مار دیتے ہیں

○

رُوٹھا جو مجھ سے وُہ مری تقدیر کی طرح
میں اُس کے پاؤں پڑ گیا زنجیر کی طرح

○

ہر کوئی پُوچھتا ہے کہ دیوانے کیا ہُوا
کچھ ہم کو ہو گیا ہے خُدا جانے کیا ہُوا

○

چلتے چلتے ہمارے قدم رہ گئے
پھر بھی پیچھے زمانے سے ہم رہ گئے

○

کون سا رستہ اُن کے گھر کو جاتا ہے
جانتے سب ہیں لیکن کون بتاتا ہے

دیدۂ بد سے برائی نہیں دیکھی جاتی
ایک روزن سے خدائی نہیں دیکھی جاتی

○

علم کتابوں میں مل سکتا ہے لیکن عرفان نہیں
اپنے آپ کو جو انسان نہ پہچانے انسان نہیں

○

ایک آبی لکیر ہے دنیا
یعنی پیاسوں کی پیر ہے دنیا

○

جذباتِ محبت کی زباں عورت ہے
رنگینیٔ تصویرِ جہاں عورت ہے

○

حق کے ساتھ کبھی انصاف نہیں ہوتا
کوئی کرے، یہ جرم معاف نہیں ہوتا

○

درد قابو میں رکھ نہیں سکتا
لہر مٹھی میں رکھ نہیں سکتا

○

زبانِ لمس جو اک بات اُس سے کہنے لگی
تمام جسم میں گہری مٹھاس بہنے لگی

پیار بھرے سپنے بھی دل کو آوارہ کر دیتے ہیں
بہترین لمحے بھی اکثر ناکارہ کر دیتے ہیں

○

میں جب گذرا بلندیِ جہاں سے
تو سر ٹکرا گیا ہے آسماں سے

○

محبتوں نے بھی ہم سے تو اِنتقام لیا
گرے جو ہم تو ہمیں خنجروں پہ تھام لیا

○

موت سے مجھ کو ڈر نہیں لگتا
سانس بھی ہمسفر نہیں لگتا

○

علم کتابوں میں مل سکتا ہے لیکن عرفان نہیں
اپنے آپ کو جو انسان نہ پہچانے انسان نہیں

○

نقاب اوڑھ کے آنا ہے تیری مجبوری
مرا ہنر مرا فن رونمائیاں کرنا
میں کیسے تیری محبت کا اعتبار کروں
تیری سرشت میں ہے بے وفائیاں کرنا

○

لے جائیں جستجوئیں کہاں کچھ پتہ نہیں
اُلجھا ہُوں ایسی ڈور میں جس کا سرا نہیں



اِتنے مضمونوں میں، مضموں اختیاری بھی تو لو
فرض پُورا کرنے والو ذِمّہ داری بھی تو لو



میرے محسن ہیں جو میری ہنسی اُڑانے آجاتے ہیں
اِک بوسیدہ قبر پہ تازہ پھُول چڑھانے آجاتے ہیں



جو گھڑی گزر گئی ہے اُس کا غم نہ کر
آنے والے وقت کی خُوشی کو کم نہ کر



کر گئے ہیں ہمیں انداز ہمارے تنہا
بھیڑ میں رہتے ہم پھر بھی ہیں سارے تنہا
لہریں آتی ہیں مگر چھُو کے گزُر جاتی ہیں
دیکھتے رہتے ہیں پانی کو کنارے تنہا



پھولوں نے اگر سیکھ لیا اُن سے تبسّم
اس میں کوئی توہینِ گلستاں تو نہیں ہے

○

روشنی میں بھی نہیں مِلتی اندھیروں سے نجات
روز سُورج لے کر آتا ہے سَحر کِس کے لِیے

○

اِنسان کے لِیے وہ عمل بہترین ہے
جس پر وہ اپنے آپ کو مجبُور کر سکے

○

آدمی اِنسانیت کی بھینٹ چڑھتے ہیں جہاں
جی رہا ہوں مَیں بھی اُس دُنیائے آدم خور میں

○

چلوں تو چلتی ہیں کچھ فصیلیں بھی ساتھ میرے
یہ راستے ہیں کہ میرے پیروں کی بیڑیاں ہیں

○

جمع برسوں حیات کرتی رہی
موت یکمشت لے گئی مجھ کو

○

لوگ بھی ہم سے روٹھ جاتے ہیں
چھالے بنتے ہیں پھوٹ جاتے ہیں
آنسوؤں سے بھرے ہوئے ہم لوگ
مسکراتے ہی ٹوٹ جاتے ہیں



خوشبو ہماری ہم سے اچانک بچھڑ گئی
چلتی ہوا نے اُڑتا پرندہ چرا لیا
محرومِ زندگی ہوئے ہم موت کے بغیر
لگتا ہے قبر نے ہمیں زندہ چرا لیا



حیات سُرخرو اچھے عمل سے ہوتی ہے
کسی بھی پیڑ کی پہچان پھل سے ہوتی ہے
تم اِس جہاں سے گزرتے ہُوئے نہ تھک جانا
کہ اِبتدائے سفر تو اَجل سے ہوتی ہے



خُشکی پہ بھی لہروں کی طرف دھیان رہے گا
دریا ہے تو سیلاب کا امکان رہے گا
آئے گی کِسی روز قیامت بھی یقیناً
انسان کا دُشمن اگر اِنسان رہے گا

حُسن تو حُسن ہے اُس کی تعریف کرنا، بُرا تو نہیں
ایک پیاسے کا پانی کے اندر اُترنا بُرا تو نہیں

○

چلتے چلتے اگر کچھ حسیں آہٹیں، راستہ روک لیں
اُن حسیں آہٹوں کے لیے بھی ٹھہرنا، بُرا تو نہیں

○

اپنے ہمراہ لے جائے خُوشبُو کسی کی تو کیا کیجیے
جس طرف سے وہ گُزرا اُدھر سے گزرنا بُرا تو نہیں

○

تنہائی بازار میں لے آئے بازاری نکلے
پیار کی باتیں کرنے والے لوگ جواری نکلے

○

آہوں کے اُس پار رہا کرتی ہے اُس کی خُوشبو
زخموں کا دروازہ کھولوں تو پُھلواری نکلے

○

گلے ملے انسان سے انساں، پھر پتھر کا پتھر
پتھر سے پتھر ٹکرائے تو چنگاری نکلے

○

زمانوں کے چمن میں مستقل پت جھڑ کا موسم تھا
وہ ہر لمحے کی ٹہنی پر گلابوں کی طرح مہکا



پیاس دور آنکھ بھگونے سے ہوا کرتی ہے
نفیِ ذات بھی رونے سے ہوا کرتی ہے
دل کے اندر بھی ہوا کرتی ہیں آنکھیں جن میں
روشنی، آگ پہ سونے سے ہوا کرتی ہے



میں شاعر کیا ہوں بس لفظوں کے گھر تعمیر کرتا ہوں
در و دیوار پر اپنا لہو تعمیر کرتا ہوں
منظفرؔ اپنی آنکھوں پر مجھے کتنا بھروسہ ہے
حقیقت کو بھی اپنے خواب سے تعبیر کرتا ہوں



نظر وفا سے گلستاں بہار سے خالی
حیات ہو گئی ہر اعتبار سے خالی



مظفر وارثی کی تخلیقات

برف کی ناؤ	غزل
بابِ حرم	نعت
لہجہ	غزل
نورِ ازل	نعت
الحمد	حمد و ثنا
حصار	نظم
لہو کی ہریالی	گیت
ستاروں کی آبجو	قطعات
کعبۂ عشق	نعت
کھلے دریچے بند ہوا	غزل
دل سے درِ نبیؐ تک	نعت
ظلم نہ سہنا	نظم
کمند	غزل
میرا آسمان	کلیات